مونوگراف

محمد حسین آزاد

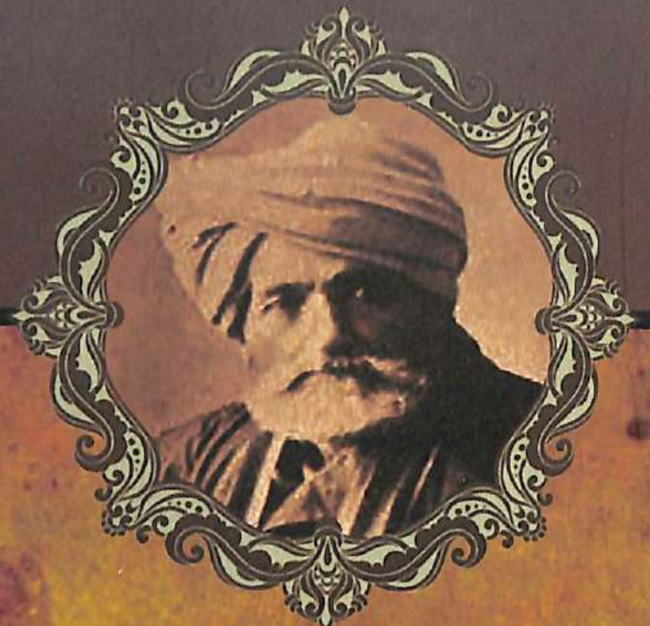

ابوالکلام قاسمی

مونوگراف

محمد حسین آزاد

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

پیش لفظ

ہمارا دور بھی عجیب ہے ایک طرف جہاں اردو زبان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے تو دوسری جانب دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ جدید تکنیکی انقلاب نے معلومات کے سمندر کو کوزے میں سمیٹ کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے ایسے میں اس خوف کا دامنگیر ہونا خلاف واقعہ نہیں کہ ہمارا قدیم و کلاسیکی ادب اس تکنیکی طلاطم کا شکار نہ ہو جائے۔

اپنے نابغہ ادیبوں و شاعروں پر مونوگراف لکھوانے کے اس نئے سلسلے کا آغاز اسی لیے کیا گیا ہے تا کہ ہم نئی نسل کے سامنے کم سے کم صفحات میں معروف ادبا کا سوانحی خاکہ بھی پیش کر سکیں اور ان کی تحریروں کے منتخب نمونے بھی۔

قومی کونسل نے اس سلسلے میں موجودہ اہم اردو قلمکاروں کی خدمات حاصل کی ہیں اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم قارئین کو براہ راست اپنے اس تجربے میں شامل کریں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اہم ادیبوں پر مونوگراف شائع کر دیں اور یہ بھی کوشش ہے کہ یہ مونوگراف معلومات کا ذخیرہ بھی ہو، اب اس معیار کو ہم کس حد تک حاصل کر سکے اس کا فیصلہ آپ کریں گے لیکن آپ سے یہ گزارش ضرور ہے کہ اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں ضرور نوازیں تا کہ ہم آئندہ ان مشوروں کو نشانِ منزل بنا سکیں۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2016
تعداد	:	550
قیمت	:	-/85روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1879

Mohammad Hussain Azad

By: Abul Kalam Qasmi

ISBN :978-93-5160-110-4

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر:49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر:26109746
فیکس:26108159 ای میل:ncpulsaleunit@gmail.com
ای میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

فہرست

	ابتدائیہ	vii
1۔	محمد حسین آزاد	1
2۔	انجمن پنجاب اور جدید نظم کی سرگرمیاں	31
3۔	آزاد کا سفر ایران	45
4۔	محمد حسین آزاد، عالمِ جنون میں	55
5۔	تصنیفات و تالیفات	59
6۔	زندگی کے آخری ایام اور وفات	65
7۔	محمد حسین آزاد اور روایتی اردو شعریات	69
8۔	اردو تنقید، محمد حسین آزاد اور نوآبادیاتی مضمرات	83
9۔	محمد حسین آزاد کی نمائندہ کتابوں کا تعارف	95
	(i) آب حیات	97
	(ii) نیرنگ خیال	101
	(iii) سخن دان فارس	103

(iv)	دربار اکبری	107
(v)	دیوان ذوق	111
(vi)	نظم آزاد	115
10۔	آزاد کی نمائندہ کتابوں کے منتخب اقتباسات	121
(i)	آب حیات	121
(ii)	نیرنگ خیال	127
(iii)	سخن دان فارس	139
(iv)	دربار اکبری	143

ابتدائیہ

محمد حسین آزاد انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے پورے عرصے میں اردو شعر و ادب کے ان نابغۂ روزگار ادیبوں اور دانش وروں میں سب سے زیادہ فعال، نمایاں اور بہت سے اعتبارات سے منفرد دانش ور اور ادیب تھے، جنھوں نے انیسویں صدی میں اردو کی نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل ڈالی تھی۔ وہ عالم بے بدل اس لیے تھے کہ ان کے علم و دانش کا دائرہ، ادب تاریخ، علم اللسان، علم لغت اور تاریخ کے مخفی گوشوں تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک تنقید نگار اس لیے تھے کہ انھوں نے اردو تنقید سے پہلے کے تذکروں کی تنقید کی عمومیت اور غیر حتمیت کو منطقی زبان اور طرز استدلال کا سبق سکھایا تھا۔ وہ شاعر اور علم شعر کے پارکھ ان معنوں میں تھے کہ انھوں نے نظم جدید کی تحریک کا آغاز کیا تھا اور غزل کے مقبول عام مزاج کو تسلسل اور مربوط شعری اظہار کی معنویت سے آشنا کیا تھا، اور وہ ایک بلند قامت انشاپرداز اس وجہ سے تھے کہ ان کے انوکھے اور بے مثال اسلوب تحریر نے ان کی ہر تحریر کو ہنوز لافانی بنا رکھا ہے۔

محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' جس طرح اردو ادب کی تاریخ کا ایک انوکھا اور یکتا نمونہ ہے اسی طرح انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے ان کا لکچر ''کچھ نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' اردو کی ادبی اور شعری نظریہ سازی کی بوطیقا کہلانے کی مستحق ہے۔ پھر یہ کہ

صحیح معنوں میں اردو تمثیل نگاری کا نقطۂ عروج ان کی کتاب 'نیرنگ خیال' ہے۔ اسی طرح 'سخن دان فارس' آزاد کی بے مثال فارسی دانی اور لسانی تحقیق و تدقیق کی معراج ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا مگر ان کی مشق و ممارست نے انھیں اپنے دور کا سب سے بڑا صاحب اسلوب بنادیا۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق کی شاگردی نے انھیں شاعری کے فن رموز و نکات سکھائے اور انھوں نے ذوق کی شاعری کی تحقیق و تدوین اور تحسین شناسی کرکے شیخ ابراہیم ذوق کو ان کی صحیح قدر و منزلت دلائی۔

محمد حسین آزاد ساری زندگی بعض نفسیاتی عوامل مثلاً خوف اور معتوبیت کے دباؤ کے زیر اثر رہے مگر وہ ہر صورت حال میں اپنے علم و فضل کا اظہار مختلف موضوعات پر لگاتار کتابیں لکھ کر کرتے رہے۔ ہر چند کہ وہ اپنے آخری زمانے میں جنون میں مبتلا تھے مگر ہر طرح کے حالات میں ان کی علمی کاوشیں سامنے آتی رہیں اور وہ اپنے ہر رنگ اور ہر روپ میں ایک نادر اور بے مثال فن کار ہونے کا ثبوت فراہم کرتے رہے۔

اس لیے محمد حسین آزاد کی یاد اور ان کی علمی کاوشوں کی بازخوانی کا سلسلہ برقرار رہنا چاہیے۔ یہ کتابچہ دراصل اسی جہت میں ایک ایسا اقدام جس کے سبب آزاد شناسی کے فروغ پانے کے امکانات پیدا ہوں گے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب میں تاریخی حوالوں کو نظر انداز نہ کرتے ہوئے محمد حسین آزاد کی تحریروں کا صحیح سیاق و سباق متعین کردیا جائے۔ اس سلسلے میں نظم جدید کی ابتدائی تاریخ بھی سامنے آگئی ہے، دہلی کالج کا علمی وقار بھی زیر بحث آیا ہے اور آزاد کی وسعت علمی کے تقریباً ہر پہلو کو سامنے لانے کا امکان پیدا ہوگیا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جس طرح برصغیر میں ہر شعبۂ زندگی میں تشکیل نو کا سلسلہ شروع ہوا اس کا سب سے زیادہ نمایاں اظہار علم و ادب کے حوالے سے سامنے آیا۔ اس پس منظر میں محمد حسین آزاد کو اردو اور فارسی شعر و ادب کو تشکیل نو سے آشنا کرنے والوں میں ممتاز ترین حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ محمد حسین آزاد کی علمی اور ادبی کاوشوں سے واقفیت فراہم کرنا دراصل ہمارے لیے اپنے اجتماعی لاشعور کی بازیافت کرنے کے مترادف بن جاتا ہے۔

ابوالکلام قاسمی

محمد حسین آزاد

(1830-1910)

شمس العلما محمد حسین آزاد اپنے غیر معمولی علمی کارناموں اور اسلوب نگارش کے باعث جتنے مقبول، کارآمد اور ہمہ جہت دکھائی دیتے ہیں ان کا خاندان اور خود ان کی اپنی زندگی اتنی ہی نشیب وفراز سے گزری تھی۔ اس لیے آزاد کی علمی اور ادبی کاوشوں کے پیچھے سرگرم عمل سیاسی اور سماجی صورت حال کو سامنے رکھے بغیر ان کی سوانح کے ساتھ کما حقہٗ انصاف نہیں کیا جاسکتا۔

محمد حسین آزاد اس شہر دہلی کے ساختہ و پرداختہ تھے جو اُن کے زمانے سے تقریباً سوسال قبل سے خاصی افراتفری، عدم استحکام اور طوائف الملوکی کی نذر رہ چکی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سے ہی مغلیہ حکومت واضح طور پر زوال آمادہ ہونا شروع ہو چکی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے آنے والے برطانوی سامراج نے اپنا اثر ونفوذ اس حد تک بڑھا لیا تھا کہ مغل شہنشاہ ہر بڑی اور چھوٹی انتظامی ضروریات کے لیے اس کے دست نگر ہو کر رہ گئے تھے۔ انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی انگریزوں کے باعث کلکتہ کی مرکزیت نمایاں ہو گئی تھی۔ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد اور انگریز حاکموں کی لسانی اور تہذیبی منصوبہ بندی نے یہ بات واضح کردی تھی کہ ہندوستان کے معاملات میں برطانیہ کی دلچسپی کا ہر عمل کتنے گہرے

اور دوررَس مضمرات رکھتا تھا۔ اردو کے ساتھ ہندی کے وجود کو آزاد اور خودکفیل انداز میں مستحکم کرنے کی کوششیں ہندستانی عوام کو پوری طرح اپنے اختیار میں لینے کے سلسلے کا آغاز تھیں۔ اس کالج کے پلیٹ فارم سے اردو اور ہندی کتابوں کے ذریعے یہاں کی تہذیب، روایت اور طرزِ فکر کے وسیلے سے برطانوی اشخاص کو تیار کرنے اور پوری طرح واقفیت فراہم کرنے کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں حد سے بڑھی ہوئی کلکتہ کی سیاسی اور سماجی سرگرمیاں ایک طرح سے دہلی کی مرکزیت کے قلعے میں دراڑ ڈالنے کے مترادف تھیں۔

مغلیہ حکمرانوں کی تاریخ میں اورنگ زیب کا انتقال دراصل سماجی اور سیاسی زوال اور ابتری کا آغاز تھا۔ اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوتے ہی کمزور اور غیر مستحکم اور سربراہوں کا دور شروع ہو گیا۔ بہادر شاہ اوّل اور بہادر شاہ ثانی کا زمانہ نہایت ابتری اور اضمحلال کا گزرا۔ 1803 میں شاہ عالم ثانی کو کمپنی نے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور اس طرح کمپنی ہی سارے سیاہ و سفید کی مالک بن گئی۔ یہ وہی زمانہ ہے جب مرکز کی کمزوری کے باعث علاقائی نوابین اور مہاراجاؤں کو تقویت حاصل ہوئی۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں جو اُن نوابین اور راجاؤں کے زیرِ اقتدار تھیں ان کے یہاں سے مغل دربار کو جاگیریں موصول ہوا کرتی تھیں وہی دراصل مغلیہ حکمرانوں کی سہل پسندانہ آمدنی کا ذریعہ بن گئیں۔ اس صورت حال نے بادشاہوں کی نااہلی اور عیش پرستی کو مزید امکانات سے آشنا کیا۔ اس زمانے میں ذاتی مفادات کو عروج حاصل ہوا، اُمرا کی ریشہ دوانیاں اپنے عروج کو پہنچ گئیں اور ظاہر ہے کہ صوبوں کی خودمختاری نے سیاسی منظرنامے کو بالکل تبدیل کر کے رکھ دیا۔ حکمرانوں کے داخلی انتشار نے بیرونی حملہ آوروں کے لیے فوج کشی کرنا آسان بنا دیا اور انتظام و انصرام کی کمزوریوں نے بیرونی حملہ آوروں کے حوصلے کو غیر معمولی طور پر بڑھا دیا۔ ان تمام خرابیوں اور انتشار کے باوجود ہندستانی عوام کو مغل بادشاہوں سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ شاہ عالم تو قلعہ معلی میں بیٹھے بظاہر بے فکری کی زندگی گزارتے تھے اور دہلی پر اگر کوئی شخص حکومت کرتا تھا تو وہ برطانوی حکمرانوں کا کوئی نہ کوئی نمائندہ تھا۔ انگریزوں کے عمل دخل کا پورا اندازہ اکبر شاہ کے زمانے میں ہی نمایاں ہونا شروع ہو گیا تھا۔ 1837 میں اکبر شاہ کے انتقال کے بعد مرزا ابوظفر سراج الدین، بہادر شاہ کے

لقب کے ساتھ دہلی کی سلطنت کے حکمراں قرار پائے، یہ ان کی ضعیفی کا زمانہ تھا۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ ان کو شروع سے ہی شعروادب سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور خود بھی ایک شاعر کی حیثیت سے متعارف تھے۔ وہ ظفر تخلص کرتے تھے۔ ایک تو بحیثیت مجموعی مغلیہ حکومت کا روبہ زوال ہونا، دوسرے بہادر شاہ ظفر کی افتادِ طبع ان کی مجہولیت پر مہر ثبت کرنے کے لیے کافی تھی۔ ان کے بے اثر ہونے کا اظہار اسی وقت سامنے آگیا تھا جب وہ اپنے ولی عہد مرزا دارا بخت کے انتقال کے بعد اپنی چہیتی بیوی کے فرزند جواں بخت کو نیا ولی عہد بنانا چاہتے تھے مگر ان کی ایک نہ چلی اور انگریزوں کی مرضی کے مطابق مرزا فخرالدین کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا گیا۔

بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں انگریزوں کی برتری کچھ زیادہ ہی مستحکم ہوگئی۔ ذرا ذرا سی بات پر بادشاہ کو انگریز ریذیڈنٹ سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ اس منظرنامے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ برطانوی سامراج کے لیے ہندوستان کی غیر مستحکم اور بڑی حد تک انگریزوں کی دست نگر مغلیہ حکومت کے آخری شہنشاہ اور اس کی بادشاہت کو اپنے زیرنگیں لانا کیوں کر دشوار نہیں رہ گیا تھا؟ مگر اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان پر مکمل غلبہ اور اپنے تسلط کے عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی انھیں کوئی جلدی نہ تھی۔ انگریز روز بروز اپنا اثر و رسوخ بڑھا ضرور رہے تھے مگر اس معاملے میں کسی بے صبری کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔ وہ پوری طرح اپنی حکمت عملی کو اس بات پر مرکوز رکھنا چاہتے تھے کہ کن کن پہلوؤں سے اپنے تسلط کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا مناسب اور دانشمندانہ رہے گا۔ مگر اس پوری صورت حال میں ہندستانی عوام میں بے چینی کا فروغ لگاتار ہو رہا تھا۔ یہاں سے ہندو اور مسلمان یکساں طور پر خود کو امتدادِ وقت کے ساتھ غلام ہوتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ یہ بات اس ضمن میں کم اہم نہیں کہ مغلیہ دورِ اقتدار میں مغلوں کے اندازِ حکومت اور مذہبی سطح پر رواداری برتنے کے انداز نے ان کو بھی یہ احساس دلا رکھا تھا کہ اگر انگریز برسرِ اقتدار آجاتے ہیں تو ان کی حکومت پوری طرح ہندستانیوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لے گی جبکہ مغلوں کی حکومت میں پورے ملک میں غیر مسلموں کی جان اور مال کی حفاظت کی پوری ضمانت ملی ہوتی تھی۔ غیر مسلموں کے برخلاف ہندستانی مسلمان

فطری طور پر مغلیہ دورِ حکومت کو اپنا دورِ حکومت تصور کرتے تھے اور کسی طرح کی بے جا طرفداری نہ ملنے کے باوجود ان کو احساس تھا کہ کئی سو سال سے ہندستان پر ہم برسرِ اقتدار ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بلاتفریق مذہب وملت ہندستانی عوام، انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے یکساں طور پر بے اطمینانی محسوس کر رہے تھے۔ یہی وہ بے اطمینانی تھی جس نے میرٹھ کی چھاؤنی میں ہندو اور مسلمان فوجیوں کو بغاوت پر آمادہ کیا اور 10 رمئی 1857 کو میرٹھ سے شروع ہونے والی بغاوت نے بہت جلد دہلی اور اس کے اطراف و جوانب کو اپنے لپیٹے میں لے لیا۔ بہت بڑے پیمانے پر انگریزوں کو قتل اور زد وکوب کا نشانہ بنایا گیا اور پوری کوشش کی گئی کہ انگریزوں کو ہر شعبۂ حیات سے بے دخل کر دیا جائے۔ ہندستانیوں کے پاس جذبات و احساسات اور غصہ ونفرت کا ہتھیار ضرور تھا مگر جدید اسلحہ جات اور دوسرے وسائل سے تو انگریز لیس تھے۔ گزشتہ سو دو سو برسوں میں اپنی دوررس حکمت عملی کے باعث وہ ہندستان میں اپنے مخصوص وسائل حیات کا بھی اضافہ کر چکے تھے، جدید اسلحہ جات اور صنعتی سامان و اسباب بھی درآمد کر چکے تھے، اپنی فوجی ٹولیاں بھی تیار کر چکے تھے اور اس طرح سادہ لوح ہندستانیوں کی سادگی اور غیر سازشی ذہنیت سے بھی پوری طرح باخبر ہو چکے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندستانیوں کی بغاوت پوری طرح ناکام ہوگئی اور وہ برطانوی حکومت جو عام حالات میں کافی دنوں بعد پوری طرح ہندستان پر قابض ہو پاتی، وہ دیکھتے ہی دیکھتے صرف لال قلعہ پر کیا پورے ہندوستان پر قابض ہوگئی۔ بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا اور وہاں نظر بند کر دیا گیا۔ دہلی کے بعد ہندوستان کی بعض ریاستوں کا معاملہ باقی رہ گیا تھا اس لیے دہلی کے بعد ان کی نظر ریاستوں کی طرف مرکوز ہوئی اور زیادہ عرصہ نہیں لگا کہ انھوں نے لکھنؤ اور دوسری ریاستوں پر بھی پوری طرح فوج کشی کرنے اور انھیں اپنے زیرنگیں لانے میں کامیابی حاصل کر لی۔

یہ وہ پس منظر تھا جس نے 1857 سے پہلے اور بہت عرصہ بعد تک کے لیے ہندستانی عوام کے لیے طرح طرح کی مشکلات کے پہاڑ راستے میں کھڑے کر دیے۔ ہندوستان چونکہ دارالخلافہ تھا اس لیے دہلی والوں کے لیے زندگی اور بھی مشکل ہوگئی تھی۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انگریزوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈال کر

اردو نثر کے فروغ کا بندوبست کیا تھا اور کچھ ہی عرصے کے بعد دہلی کالج کی سرپرستی کرنے مشرقی ومغربی علوم کے فروغ کے لیے بڑے اہم اور کارآمد اقدامات کردیے تھے۔ انگریزوں کی اس نوع کی کاوشوں میں ان کے اپنے سماجی اور سیاسی مفادات جس قدر بھی شامل رہے ہوں، ان کے باعث ہندستانی زبان وادب اور تہذیب کو بھی استحکام ملا تھا۔ علمی اور تدریسی اداروں کے اس ذکر کا مدعا یہ ہے کہ اس زمانے میں دہلی کے بیشتر ایسے لوگ جن کو مشرقی ومغربی علوم سے یکساں طور پر واقفیت درکار تھی وہ عموماً دہلی کالج کی طرف ہی رجوع کرتے تھے۔

نسلی وراثت:

محمد حسین آزاد دراصل دو نسل قبل دہلی کی اسی متذکرہ فضا کے پروردہ تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ تو ہمدان سے کشمیر آئے تھے اور بعد میں انھوں نے کشمیر سے دہلی آکر کشمیری دروازے میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان کے دادا ایک کتب میں ابتدائی درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ تھے۔ آزاد نے بھی ابتدائی کتابیں اپنے دادا سے ہی گھر پر اور مکتب میں پڑھی تھیں۔ مگر ان کے والد مولوی محمد باقر دہلی کے ماحول میں رچنے بسنے کے بعد دہلی کے اہلِ علم حضرات کے تعلق میں آئے۔ نئی روشنی اور علم وفضل کی خوشبو ان میں شروع سے ہی پائی جاتی تھی۔ وہ باصلاحیت بھی تھے اور دوراندیش بھی۔ انھوں نے دہلی کالج سے وابستگی اختیار کی اور اپنی تعلیم وہیں سے مکمل کی۔ دہلی کالج میں انھوں نے بعد میں درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ کچھ عرصے کے بعد وہاں سے استعفیٰ دے دیا اور سرکاری محکمہ میں ملازم ہوگئے۔ رفتہ رفتہ وہ تحصیل دار بھی بن گئے تھے۔ یہ ملازمت، کام کی نوعیت اور آمدنی کے اعتبار سے بہت اطمینان بخش تھی مگر دہلی کے بیشتر محکمہ جات انگریزوں کے انتظام وانصرام کے تحت آچکے تھے۔ جبکہ مولوی محمد باقر اور ان سے کہیں زیادہ ان کے والد مولوی محمد اکبر دونوں انگریزوں کی غلامی کو غیروں کی غلامی تصور کرتے تھے۔ شاید یہی بے اطمینانی تھی کہ ملازمت کے زمانے میں ہی مولوی محمد باقر نے ایک چھاپہ خانہ قائم کرلیا۔ اس پریس سے انھوں نے ایک اخبار بھی نکالنا شروع کردیا جو شروع سے ہی بڑا مقبول ہونے لگا۔ چونکہ مولوی محمد باقر سرکاری ملازمت میں

تھے اس لیے اخبار پر ان کا نام نہیں چھپتا تھا، مگر لوگوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس اخبار کا سارا نظم و ضبط ان ہی کا قائم کردہ ہے اور اس اخبار کے روح رواں بھی وہی ہیں۔ مولوی محمد باقر کی صحافت اور اس فن میں ان کے تقدم سے تمام لوگ واقف تھے اور اردو صحافت کی تاریخ میں وہ آج تک ایک بااصول صحافی اور روشن خیال دانشور کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں — اپنی ملازمت اور پریس سے جو آمدنی ہوتی تھی اس سے مولوی محمد باقر نے کشمیری دروازے میں مغلیہ انداز کی ایک بڑی سی حویلی تیار کرائی تھی۔ اس حویلی میں جہاں مردانہ اور زنان خانہ الگ الگ تھے وہیں پریس کے لیے بعض کمرے مخصوص کیے گئے تھے اور بعض میں پریس کے ملازمین کے قیام کا انتظام رکھا گیا تھا۔ مولوی محمد باقر نہایت خوش اخلاق اور سوشل تعلقات کو نباہنے والے انسان تھے۔ سرکاری معاملات میں بھی ان کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ دخل رہا کرتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں دربار سے وابستہ لوگوں میں ان کی عزت و پذیرائی بہت تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے استاد، شیخ محمد ابراہیم ذوق ان کے ہم مکتب رہ چکے تھے۔ دونوں میں ہمیشہ برادرانہ تعلقات قائم رہے اور کبھی اس راہ و رسم میں فرق نہیں آیا۔ مولوی محمد باقر کی ہمہ جہتی کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف مغلیہ دربار سے ان کے مراسم تھے اور دوسری طرف انگریزوں سے بھی ان کے تعلقات اچھے تھے۔ مختلف اوقات میں دہلی کالج کے انگریز پرنسپل سے بھی ان کا ملنا جلنا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وسیع المشربی کے سبب ان کے بدخواہ بھی بہت تھے۔ ان پر ایک سے زیادہ بار جان لیوا حملہ بھی ہو چکا تھا مگر وہ کبھی اس طرح کی باتوں سے خوف زدہ یا ہراساں ہونے والوں میں سے نہیں رہے۔ وہ پوری توجہ، دیانت داری اور خلوص کے ساتھ اپنے انتظامی اور علمی معاملات کو سرانجام دیتے رہے — اس زمانے میں اتفاق سے شیعہ حضرات دہلی میں دو گروہوں میں بٹ گئے تھے: ایک باقری حضرات کا گروہ تھا اور دوسرا جعفری لوگوں کا۔ مولوی محمد باقر کو بھی اس قضیے میں گھسیٹنے کی کوشش کی گئی۔ قاری جعفر علی ان کے حریف تھے اور اس حد تک تھے کہ مولوی صاحب کے جانی دشمن بن گئے تھے۔ ان دونوں گروہوں کے علما نے ایک دوسرے کے خلاف متعدد دل آزار اور توہین آمیز کتابچے بھی شائع کیے۔ اشتہارات لگاتار لگائے جاتے تھے اور فتوے بھی صادر کیے جاتے

تھے۔ اس زمانے میں استاذ ذوق کا بڑا چرچا تھا۔ استاذ ذوق اس مناقشے میں مولوی محمد باقر کے حامی تھے اور اس کے برخلاف مرزا غالب کی رسم و راہ قاری جعفر علی سے تھی۔ ان تمام معاملات میں مولوی محمد باقر کے مخالفین نے دو ایک بار ان کی جان بھی لینے کی کوشش کی۔ ایک شام جب اندھیرا بڑھنے لگا تو کسی نے ان کے گھر کے باہر سے آواز دی، کوئی اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا اس لیے خود مولوی صاحب باہر نکلے تو آواز دینے والے نے پے در پے چھرے سے کئی وار کیے اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ مگر مولوی صاحب خدا کے فضل و کرم سے بال بال بچ گئے اور چند دنوں کے بعد پوری طرح صحت مند ہو گئے۔

آزاد کی ولادت کا زمانہ:

مولوی محمد باقر کا دور عروج اور شیعہ حضرات کے دوگروہوں کی مخاصمت کا زمانہ کم و بیش وہی ہے جس زمانے میں محمد حسین آزاد کی ولادت ہوئی۔ محمد حسین آزاد کی تاریخ پیدائش میں مورخوں کے درمیان قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ زیادہ مشہور اور معتبر تاریخ ولادت 18/ذی الحجہ 1245 ہجری مطابق 10/جون 1830 تصور کی جاتی ہے ــــ آغا محمد باقر نے ان کی پیدائش کا مادہ تاریخ 'ظہور اقبال' لکھا ہے۔ اس کی مناسبت ــ سے آزاد کی ولادت کا سال 1827 ہوتا ہے جو کسی بھی طرح 18/ذی الحجہ 1245 ہجری کے مطابق ہو ہی نہیں سکتا۔ 'ظہور اقبال' دراصل استاذ ذوق کی کہی ہوئی ہجری تاریخ پر مبنی ہے اس لیے اس کے مطابق عیسوی سنہ کا تعین ممکن ہے جو 1830 کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق نے بھی اپنی کتاب میں ان کی تاریخ ولادت 10/جون 1830 ہی لکھی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آزاد کی پنشن کی درخواست میں بھی 10/جون 1830 ہی تاریخ لکھی جسے بعد میں کاٹ کر 1835 بنایا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک تحریف تھی جو درست نہ تھی۔

محمد حسین آزاد کی والدہ امانی خانم ایک نو وارد نجیب الطرفین ایرانی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، لیکن آزاد ابھی تین چار ہی برس کے رہے ہوں گے کہ امانی بیگم کا انتقال ہوگیا۔ اس جان لیوا صدمے سے آزاد کا باہر آنا بظاہر مشکل معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس حالت میں ان کی پھوپھی نے سہارا دیا اور گو ۱ آزاد کی پرورش و پرداخت کی ساری ذمہ داری اپنے

سر لے لی۔ آزاد اس کم عمری میں بھی اتنے جذباتی، حساس اور ذہین تھے کہ اپنی اماں کے آخری ایام کو وہ بہت عرصے تک یاد کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد کسی نے کفنائی ہوئی ماں کی لاش آزاد کو دکھلا دی۔ پھر کیا تھا آزاد نے چیخ ماری اور کہا کہ یہ میری امی نہیں ہیں، یہ میری امی نہیں ہیں۔ والدہ کے انتقال کے صدمے کے زمانے میں آزاد کے والد مولوی محمد باقر تو بیٹے کی طرف سے فکرمند رہتے ہی تھے مگر ان کے دادا مولوی محمد اکبر نے خاص نگہ داشت رکھنی شروع کی۔ زیادہ تر وقت پوتے کے ساتھ گزارتے۔ شروع سے ہی کچھ نہ کچھ پڑھاتے اور سکھاتے بھی رہتے تھے۔ کچھ عرصے بعد مولوی محمد باقر نے دہلی کالج کے ایک استاذ ماسٹر حسینی کی بہن سے نکاح پڑھوالیا۔ سوتیلی ماں نے بہت جلد پر پرزے نکالے اور سوتیلے پن کے احساس سے محمد حسین آزاد کو غیر معمولی طور پر دوچار کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ انھیں پھوپھی کا سہارا حاصل تھا مگر سوتیلی ماں کے غیض وغضب نے ان کی نفسیات کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ ان حالات کی وجہ سے آزاد شروع سے ہی بے حد جذباتی سے ہو گئے تھے۔

مولوی محمد اکبر نے اس صورت حال میں محمد حسین آزاد کی مکتبی تعلیم کا آغاز کرادیا۔ ابتدا میں 'خالق باری' اور 'مقیما' پڑھائی گئی اور اس کے بعد گلستاں اور بوستاں پڑھا دی گئی۔ محمد حسین چونکہ اپنے گھر میں فارسی زبان سے نہ صرف مانوس تھے بلکہ ان کی امی فارسی ہی بولتی تھیں، اس لیے سعدی کی گلستاں اور بوستاں نے ان کے ذوق کو صیقل کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ شعریت اور سوزونیت ان کے خمیر میں شامل ہوگئی۔ یوں تو ان کی تعلیم دادا مولوی محمد اکبر کی سرپرستی میں ہورہی تھی مگر مولوی محمد باقر اپنے بیٹے کی تعلیم اور علمی دلچسپیوں سے بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ کچھ دنوں کے بعد عربی کی تعلیم شروع کرادی گئی۔ اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم فرخی اپنے ایک مضمون ''محمد حسین آزاد، خوانده، شنیده، فہمیده'' میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''آخر کار ایک دن مولوی محمد اکبر بھی انھیں درس دیتے دیتے استاذ ازل کے حضور پہنچ گئے۔ نوعمر محمد حسین کے ذہن میں ایک اور گرہ پڑگئی۔ شفیق دادا سے انھیں بڑی محبت تھی۔ دیکھتے رہتے کہ وہ فرصت کے اوقات میں ایک قصیدے

کی نقل تیار کرتے رہتے۔ اس قصیدہ کا تیسرا شعر انھیں بہت پسند تھا۔ اکثر
پڑھا کرتے تھے۔ محمد حسین کو بھی یہ قصیدہ یاد ہو گیا تھا — شفیق دادا نے پوتے
کو خوش نویسی بھی سکھائی تھی۔ خوش نویسی اس زمانے میں جزو تعلیم بھی تھی۔
گھر کے پریس کی وجہ سے محمد حسین آزاد کو کاپی لکھنے کی مشق بھی کرائی گئی تھی
تاکہ ہاتھ سدھر جائے اور ہنگامی صورت حال میں وہ کاتب کا فریضہ بھی
انجام دے سکیں۔ محمد حسین نے یہ کام بھی خوشی خوشی سیکھ لیا۔''

(ڈاکٹر اسلم فرخی)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے علوم متداولہ کے ساتھ سارے متعلقہ علوم لڑکپن میں ہی سکھا دیے جاتے تھے۔ محمد حسین آزاد کی علمی بنیادیں اسی باعث غیر معمولی طور پر مضبوط اور مستحکم ہو گئی تھیں۔

تعلیم و تعلم:

ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد محمد حسین آزاد دہلی کالج میں داخل ہو گئے۔ وہاں ان کے جوہر اور بھی زیادہ نکھرے۔ ان کا داخلہ 1845 میں ہوا تھا۔ شروع سے ہی سولہ (16) روپے وظیفہ ملنا شروع ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد آزاد دہلی کالج کے طالب علموں میں نمایاں نظر آنے لگے۔ دہلی کالج اس وقت مشرقی اور مغربی تعلیم کی ہم آہنگی کا شاید ہندوستان میں سب سے نمایاں ادارہ تھا۔ وہاں آزاد نے دوسرے عقلیہ اور نقلیہ علوم کے ساتھ فقہ اور دینیات کی بھی بھرپور تعلیم حاصل کی، مگر ایک اہم بات یہ ہوئی کہ کالج میں شیعہ دینیات کے استاد وہی قاری جعفر تھے جو دہلی میں شیعوں کے دو گروہوں میں سے ایک کی قیادت کرتے تھے اور جن سے ان کے والد مولوی محمد باقر کا مناقشہ رہ چکا تھا۔ مگر اس مناقشے سے الگ محمد حسین اپنے مزاج اور معلومات کے اعتبار سے چونکہ بہت تیز، طباع اور باخبر تھے اس لیے ہر جماعت میں استاذ سے سوالات بھی کیا کرتے تھے اور بحث و مباحثے میں بھی کسی سے پیچھے رہنے والے نہیں تھے۔ قاری محمد جعفر کو محمد حسین کے اعتراضات بہت گراں گزرتے تھے اور بہت جلد

انھوں نے محمد حسین کے سوالات سے تنگ آ کر اپنی جماعت میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ محمد حسین آزاد نے اس کے بعد سنّی دینیات کے استاذ سید محمد صاحب سے رابطہ قائم کیا اور ان کی جماعت میں بیٹھنے کی اجازت طلب کی۔ اس طرح انھوں نے سنّی دینیات کی تکمیل کی۔ شیعہ دینیات سے وہ پہلے سے بھی خوب واقف تھے اور اب سنّی دینیات کی تعلیم حاصل کرنے وہ فقہ جعفری کے ساتھ فقہ حنفی میں بھی ماہر ہو چکے تھے۔

دہلی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے درمیان محمد حسین آزاد کو طرح طرح سے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع ملے۔ تحریر اور تقریر میں ان کی مہارت بہت جلد تسلیم کی جانے لگی تھی۔ کالج کے مقابلۂ مضمون نگاری میں ان کو دو مرتبہ انعام سے نوازا گیا۔ اسی زمانے میں دہلی کالج میں مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ بھی زیر تعلیم رہے۔ نذیر احمد نے اپنی تعلیم 1854 میں مکمل کر کے فراغت حاصل کی اس لیے گمان غالب ہے کہ ان کے ساتھی محمد حسین آزاد بھی 1854 تک زیر تعلیم رہے۔ محمد حسین، طلبا اور اساتذہ کی نظر میں بہت جلد ممتاز حیثیت پا چکے تھے۔ ایک مرتبہ کلکتہ سے مدراس کے کمشنر ڈاکٹر مویت نے دہلی کالج کا دورہ کیا۔ ممتاز طالب علموں سے ملتے ہوئے ان کی ملاقات آزاد سے بھی ہوئی۔ ڈاکٹر مویت نے محمد حسین سے پوچھا کہ تمھارا تعلیم حاصل کرنے کا مقصد کیا ہے۔ جواب میں محمد حسین نے کہا کہ ''میں کالج میں پوری تعلیم حاصل کروں گا اور جو اعلیٰ خیالات ہوں گے انھیں اپنے وطن میں عام کرنے کی کوشش کروں گا۔'' اس بات کا ذکر ڈاکٹر مویت کی اس رپورٹ میں تفصیل سے درج ہے جو انھوں نے 54-1853 میں لکھی تھی۔ اس رپورٹ سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ آزاد 1854 تک دہلی کالج میں ضرور زیر تعلیم رہے تھے۔

یوں تو محمد حسین نے طالب علمی کے زمانے سے ہی اپنے والد کے اخبار 'دہلی اردو' اخبار کی شاعت میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی مگر 30/اکتوبر 1853 کے شمارے سے پرنٹر پبلشر کی حیثیت سے باقاعدہ طور پر ان کا نام اخبار میں چھپنے لگا تھا۔ یہ سلسلہ 1857 تک چلتا رہا۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ کالج میں ان کا رابطہ مولوی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ اور خواجہ ضیاء الدین جیسے ہم جماعتوں سے رہا۔ منشی ذکاء اللہ سے ان کے مراسم تاعمر قائم رہے۔ جس زمانے میں اخبار

سے مولوی محمد حسین آزاد کی وابستگی ہوئی اسی وقت سے ان کی تحریریں بھی اخبار میں چھپنا شروع ہوئیں۔ مگر انھوں نے اپنی تحریروں میں دہلی کالج کا تذکرہ کم سے کم کیا ہے۔ اس لیے کہ کالج سے ان کی بہت خوش گوار یادیں وابستہ نہیں تھیں۔

شیخ ابراہیم ذوق سے شرف تلمذ:

جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ محمد حسین کے والد ماجد کے شیخ ابراہیم ذوق سے دوستانہ مراسم رہے تھے، اس لیے بھی محمد حسین آزاد شروع سے ہی استاذ ذوق کی خدمت میں حاضر ہونے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ استاذ ذوق، محمد حسین آزاد پر اتنی شفقت فرمانے لگے گویا انھوں نے آزاد کو اپنے بیٹے شیخ اسماعیل جیسی حیثیت دے دی تھی۔ کالج کی تعلیم کے زمانے سے ہی آزاد کا ذوق کے گھر آنا جانا لگا رہتا تھا، بلکہ یوں کہیے کہ کالج سے جیسے ہی فرصت ملتی آزاد، استاذ ذوق کے گھر پہنچ جاتے۔ آزاد نے شعروادب کے رموز بھی استاذ سے ہی سیکھے تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ استاذ ذوق کا کلام ان کے والد مولوی محمد باقر کے پاس ہی جمع رہا کرتا تھا، قدرے بعد میں محمد آزاد ہی اس کے محافظ قرار پائے۔ ان کو کثرت سے استاذ کے اشعار یاد تھے۔ ان کی یادداشت پر استاذ ذوق کو اتنا بھروسہ تھا کہ اکثر استاذ ذوق اپنا کوئی بھولا ہوا شعر یا مصرع ان سے ہی دریافت کیا کرتے تھے اور بسا اوقات ان پر نظرثانی کرتے ہوئے بھی آزاد کے ذوقِ شعری کا لحاظ رکھا کرتے تھے۔ 1845 میں آزاد نے اپنے آغازِ جوانی میں ہی استاذ ذوق کے ساتھ پہلی بار مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی محمد حسین استاذ ذوق کے توسط سے دہلی کی بزمِ سخن سے واقف ہونے لگے تھے۔ محمد حسین سے محمد حسین آزاد تک کا سفر دراصل استاذ ذوق کے نگرانی میں ہی طے ہوا تھا۔ ان میں تحقیق و تجسس اور علمی دلچسپی کا مادہ شروع سے موجود تھا۔ استاذ ذوق کی صحبت نے اس میں جلا بخش دی۔ محمد حسین آزاد نے دیوانِ ذوق کے مقدمے میں استاذ سے اپنے روابط اور ان سے کسب فیض کے متعدد واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔ استاذ سے محمد حسین آزاد کے مراسم میں کبھی فرق نہیں آیا۔ دہلی کالج سے فراغت کے بعد بعض سوانح نگاروں کے مطابق آزاد کچہری میں روزنامچہ

نویس ہو گئے تھے، مگر چونکہ اس زمانے میں بھی مولوی محمد باقر کے اخبار میں پرنٹر پبلشر کے طور پر آزاد کا نام آتا رہا اس لیے گمان غالب ہے کہ انھوں نے کچہری کی ملازمت نہیں کی تھی، ورنہ ان کا نام اخبار میں نہیں چھپ سکتا تھا۔ اس زمانے میں تقریباً ہر شمارے میں آزاد کی تحریریں شائع ہوا کرتی تھیں۔ حالانکہ اس وقت عموماً تحریروں پر لکھنے والوں کے نام نہیں چھپتے تھے مگر آزاد کا اسلوب نگارش اپنے آپ چغلی کھاتا تھا اور اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ نیم سماجی اور نیم سیاسی تحریریں بھی وقتاً فوقتاً لکھا کرتے تھے اور وہ چیزیں اردو اخبار میں چھپا کرتی تھیں۔

اس بات کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے کہ استاذ ذوق کا سارا کلام عموماً مولوی محمد باقر کے پاس جمع رہا کرتا تھا، بعد میں یہ ذمہ داری محمد حسین آزاد نے سنبھال لی۔ محمد حسین آزاد بہت سنبھال سنبھال کر ان کے اشعار رکھ لیا کرتے، جہاں کہیں ان کے شعر سنتے انھیں نقل کر لیا کرتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شروع سے ہی دیوانِ ذوق کو ترتیب دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ چونکہ استاذ ذوق کو بھی محمد حسین کے ذوق پہ پورا بھروسہ تھا اس لیے استاذ کی مرضی بھی اس میں شامل تھی۔ استاذ اپنے شاگرد پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ جب کبھی کوئی نیا شعر، نئی غزل یا نیا قصیدہ کہتے تو اس کی تکمیل سے پہلے ہی محمد حسین کو سنا دیا کرتے اور ان کا ردِ عمل جاننے کی کوشش کیا کرتے۔ خود آزاد نے دیوانِ ذوق کے مقدمے میں اس نوع کے متعدد واقعات نقل کیے ہیں جن میں سے ایک واقعہ کچھ اس طرح ہے:

> ''میں حسبِ معمول خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اس وقت اپنے قصیدے کے شعر لکھ رہے تھے۔ چنانچہ اشعار اس کے سنانے لگے۔ مطلع تھا:
>
> زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر
> عیاں ہو خامے سے تحریر نغمہ جائے صریر
>
> اس کے آگے شعر سناتے جاتے تھے، میں تعریف کرتا جاتا تھا۔ وہ مسکراتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب یہ شعر پڑھا:
>
> ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ
> کہ جیسے جائے کوئی فیلِ مست بے زنجیر

بے اختیار میری زبان سے نکلا سبحان اللہ! رنگینی اور یہ زور۔ظہوری کا ساقی نامہ مات ہوگیا۔ چپ ہو گئے، اور کہا کہ اس میں زور آتا جاتا ہے، میں کُھلا جاتا ہوں —'' (دیوانِ ذوق۔ص:218)

اس سلسلے میں ایک اور واقعہ بھی سننے کے قابل ہے۔اس لیے کہ استاذ ذوق فارسی شعرا سے جس طرح کا استفادہ کرتے تھے اس کی داد بھی محمد حسین آزاد سے بہتر اور کون دے سکتا تھا۔اسی دیوانِ ذوق میں ایک اور جگہ آزاد لکھتے ہیں کہ:

''1851 میں بادشاہ بیمار ہوکر اچھے ہوئے۔ بڑی خوشی ہوئی کہ بڑھاپے میں خدا نے دوسری زندگی دی۔غسلِ صحت کا جشن قریب تھا۔ استاذ نے مبارک باد کا قصیدہ شروع کیا ہوا تھا۔تمہید میں کہا تھا کہ خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی اس میں تضمین کردیں گے:

مئے دوسالہ و محبوب چاردہ سالہ
ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

اسی عرصے میں ایک دن میں گیا تو جو شعر پرچوں پر تھے انھیں ترتیب دے دیا تھا، سنائے۔انھیں میں قطعہ پڑھا:

ہوا ہے مدرسہ بھی درس گاہ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں بدرِ منیر
اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ اب بھئی وہ شعر؟ میں نے کہا، اب کیا ضرورت رہی۔آنکھ بند کرکے فرمایا:

یہ ادھر ہی کا فیضان ہے''۔ (دیوان ذوق۔ص:219)

استاذ ذوق کی موجودگی میں محمد حسین آزاد جو بھی شعر گوئی کرتے تھے اس کی اصلاح استاذ ذوق سے ہی لیا کرتے تھے۔ 1854 میں استاذ ذوق کا انتقال کیا ہوا محمد حسین کی دنیا ہی

اُجڑ گئی۔ ان کے انتقال کے بعد کچھ عرصے تک آزاد نے آغا جان عیش سے مشورہ سخن کرنا شروع کیا جس کا سلسلہ کم و بیش دو برس جاری رہا، لیکن آزاد نے ہمیشہ اپنی تحریروں میں خود کو تلمیذ ذوق ہی لکھا۔ 1857 کے انقلاب کے چند روز بعد ہی آغا جان عیش کا انتقال ہو گیا۔ محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں اس دور کے شعرا کا ذکر کرتے ہوئے آغا جان عیش کا بھی بہت خوب صورت انداز میں ذکر کیا ہے اور ان کی شاعری کے ساتھ ان کے عادات و اطوار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

مولوی محمد باقر کی سزائے موت:

مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے مراسم اور بالخصوص دہلی کالج سے وابستگی کا جو ذکر آ چکا ہے اس میں یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ اس زمانے کے ایک سے زیادہ پرنسپل سے ان کے دوستانہ مراسم رہ چکے تھے۔ 1857 تک جس پرنسپل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی وہ مسٹر ٹیلر تھے جو ایک مستشرق ہونے کے ساتھ بہت اچھے منتظم بھی تھے۔ مولوی محمد باقر کا ان سے عرصے سے ملنا جلنا تھا اور دہلی اردو اخبار کی قوم پسندی یا مغلیہ دربار میں رسائی کے باوجود یہ مراسم ہمیشہ برقرار رہے تھے، بلکہ اس سلسلے میں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مسٹر ٹیلر سے ہی پریس خرید کر مولوی محمد باقر نے وہاں سے اپنا اخبار چھاپنا شروع کیا تھا۔ 11/مئی 1857 کو میرٹھ سے دہلی تک تو افراتفری مچی ہوئی تھی، دہلی کالج میں بھی لوٹ مار شروع ہو گئی۔ اس عالم میں انگریز اساتذہ نے میگزین میں پناہ لی لیکن کہیں سے جب مدد نہیں پہنچی تو اس کو غیر محفوظ سمجھ کر انگریزوں نے خود ہی میگزین کو نذرِ آتش کر دیا۔ کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر اپنی جان کی حفاظت کی غرض سے ایک خانساماں کے گھر میں جا کر چھپ گئے۔ اس خانساماں نے انھیں مولوی محمد باقر کے گھر زیادہ حفاظت کی غرض سے پہنچا دیا، لیکن آس پاس کے علاقے میں ان کے چھپنے کی خبر بہت جلد پہنچ گئی۔ اس لیے مولوی محمد باقر نے انھیں ہندستانی لباس پہنا کر چپکے سے باہر نکال دیا۔ وہ کچھ ہی دور گئے تھے کہ لوگوں نے انھیں پہچان لیا اور اس طرح زد و کوب کیا کہ وہیں ان کی جان نکل گئی۔ مرنے سے قبل کچھ کاغذات مسٹر ٹیلر کے پاس تھے۔ انھوں نے امام باڑے (جہاں وہ مولوی محمد باقر کے گھر میں چھپے ہوئے تھے) سے نکلنے سے پہلے بعض اہم

کاغذات مولوی محمد باقر کے حوالے کردیے تھے تاکہ حالات بہتر ہونے کے بعد وہ اسے افسر اعلیٰ تک پہنچا دیں۔ مولوی محمد باقر نے وعدہ وفا کرتے ہوئے وہ کاغذات متعلقہ افسر مسٹر ہڈسن کو پہنچا دیے۔ تب اس کو معلوم ہوا کہ مسٹر ٹیلر مارے جاچکے ہیں۔ اس کے بعد ہڈسن نے بغاوت کے جرم میں مولوی محمد باقر کو گرفتار کروالیا۔ چونکہ دہلی اردو اخبار کی ادارت، ادارتی پالیسی، مغلیہ حکومت سے ان کی وفاداری اور ہنگامے کے زمانے میں اس کا نام بدل کر 'اخبار الظفر' رکھے جانے جیسی تمام باتیں مولوی محمد باقر کو مشتبہ بلکہ مجرم ثابت کرنے کے لیے کافی تھیں، اس لیے ایک معنی میں مسٹر ٹیلر کا قاتل مولوی محمد باقر کو ہی ثابت کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ اس زمانے میں مولوی صاحب کے اخبار میں انگریزوں سے جہاد کا فتویٰ بھی شائع ہوا تھا اور یہ بھی ان کو معلوم تھا کہ مولوی صاحب کا تعلق براہِ راست شاہی فوج سے بھی تھا اور خود مولوی محمد باقر بھی عملی طور پر اس جنگ میں شریک رہ چکے تھے۔ ان تمام باتوں کو شہادت مان کر مولوی محمد باقر پر جرم ثابت کردیا گیا اور بالآخر ان کی تمام املاک ضبط کرلی گئیں اور انھیں موت کی سزا کا مستحق قرار دے دیا گیا۔ موت سے قبل وہ چودہ دن سے زیادہ قید میں رہے اور اس کے بعد 19 ستمبر 1857 کو انھیں گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔

والد کو سزائے موت ملنے کے ساتھ ساتھ مولوی محمد حسین آزاد اور ان کے کنبے کے سارے لوگوں کو جس طرح کسمپرسی اور خوف و ہراس کی فضا میں رہنا پڑا، اس کا محض اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ محمد حسین آزاد کی شادی آٹھ نو سال قبل مرزا محمد علی کی صاحب زادی آغائی بیگم سے ہوچکی تھی۔ 1857 کی افراتفری میں ایک روز توپ یا گولے کی ہیبت ناک آواز ایسی آئی کہ ان کی ایک شیرخوار بچی بے ہوش ہوگئی اور پھر اس پر سکتے کی کیفیت طاری رہی۔ اسی عالم میں چند روز کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

مولوی محمد باقر کی گرفتاری اور ان پر فردِ جرم عائد ہونے کے ساتھ ہی ان کا پورا کنبہ عدم تحفظ کے سبب اپنی بقا کے لیے سخت فکرمند ہوگیا۔ پھر ان کو گولی مار کر شہید کردیے جانے کے بعد گو محمد حسین آزاد بھی اپنے اور اپنے خاندان کے گرد منڈلاتے ہوئے خطرات کو شدت سے محسوس کرنے لگے۔ اس عالم میں سوائے دہلی چھوڑنے کے کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ محمد حسین

آزاد دہلی چھوڑ کر کہاں گئے اور ابتدائی دو سال تک کیا کرتے رہے، اس سلسلے میں مختلف روایتیں ہیں۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے دہلی کالج میں لکھا ہے کہ:

> ''مولوی محمد حسین آزاد کا بھی وارنٹ کٹ گیا تھا۔ مسٹر ٹیلر کے مارے جانے میں ان کی بھی سازش خیال کی گئی اور ان پر بھی قوی شبہ تھا مگر یہ راتوں رات نکل بھاگے اور کئی سال تک سرزمین ایران میں بادیہ پیمائی کرتے رہے۔ جب معافی ہوئی تو ہندوستان واپس آئے۔''

غریب الوطنی اور بے سروسامانی کے شب وروز:

بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ اس بے سروسامانی میں دہلی سے نکلنے کے بعد طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے محمد حسین کسی نہ کسی طرح لکھنؤ پہنچ گئے۔ لکھنؤ میں قیام بہت مختصر رہا مگر پھر بھی میرانیس، مرزا دبیر اور میر کلّو وغیرہ سے ملاقات کا موقع ملا۔ مگر آزاد اپنے آپے میں کب تھے کہ ادبی اور علمی طور پر ان لوگوں سے روابط کے مستحکم ہونے کا موقع مل پاتا۔ اسی اثنا میں انھیں خبر ملی کہ ان کی گرفتاری کے احکامات جاری ہو چکے ہیں، اس لیے اسی بدحواسی میں انھوں نے دکن کا رُخ کیا اور چند روز تک نیل گری کے ملٹری اسکول میں استاذ کی حیثیت سے خدمات بھی انجام دیں۔ وہاں جی نہ لگا تو بمبئی چلے گئے اور وہاں سے ہوتے ہوئے فروری 1859 میں پنجاب کی ریاست جُند میں آ کر قیام کیا اور چند مہینے تک وہاں محکمہ فوج داری میں ملازمت بھی کی — ویسے زیادہ تر سوانح نگاروں نے جُند میں ان کی آمد اور قیام کو تسلیم کیا ہے۔ جُند پنجاب کی مشہور ریاست تھی۔ اس زمانے میں ریاست کے فرماں روا سروپ سنگھ تھے جو 1837 میں تخت نشین ہوئے تھے، اس سے قبل سروپ سنگھ نے چونکہ انگریزوں کے لیے بہت سی خدمات انجام دی تھیں اس لیے ان کو ریاست میں یہ مقام ملا تھا۔ آزاد کوئی دس مہینے تک اس ریاست سے وابستہ رہے۔ وہاں سے وہ جگراؤں روانہ ہو گئے جو لدھیانہ تحصیل کا صدر مقام ہے اور لدھیانہ سے 29 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ جگراؤں سے ارسطو جاہ مجمع البحرین نام سے ایک اخبار نکالتے تھے۔ یہ بات آزاد کو معلوم تھی، یہ وہی ارسطو جاہ تھے جن کا اصل

نام مولوی رجب علی تھا اور جو دہلی میں مولوی محمد اکبر اور مولوی محمد باقر کے شاگرد رہ چکے تھے۔ مجمع البحرین میں آزاد کو کتابت اور پریس کا کام مل گیا۔ چونکہ وہ دہلی میں اپنے پریس کی وجہ سے اس سلسلے کے کاموں سے خوب واقف تھے اس لیے وہ اپنی خدمات بہ حسن و خوبی انجام دیتے رہے — اتفاق سے آزاد جب جگراؤں پہنچے تھے اس وقت مولوی رجب علی شہر سے باہر تھے اور ناظم مطبع نے ان کو پریس میں ملازمت دے دی تھی۔ جب مولوی رجب علی باہر سے واپس آئے تو ان کے بچوں نے محمد حسین آزاد کا ذکر کیا۔ اس اطلاع کے بعد انھوں نے آزاد کو بلوایا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا اور رجب علی نے ان کو گلے لگایا۔ انھوں نے آزاد کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا اور دوسری سہولتیں بھی فراہم کرادیں۔ انھوں نے اس بات کے لیے بھی مجبور کیا کہ وہ اپنے گھر والوں کو بھی سونی پت سے جگراؤں بلوالیں — یوں تو آزاد کا گزارا جگراؤں میں ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا مگر وہاں کی محدود فضا ان کے لیے ناکافی تھی۔ اس لیے انھوں نے لاہور جانے کا ارادہ کرلیا۔ اس زمانے میں آزاد کے پھوپھی زاد بھائی محمد علی لاہور کے پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ 1861 کے اواخر میں لاہور پہنچنے کے بعد آزاد کو پوسٹ آفس میں ملازمت مل تو گئی مگر اس وقت کوئی تنخواہ نہ تھی۔ مگر تین ماہ بعد 11/جولائی 1861 کو تیس روپے ماہوار پر ان کا باقاعدہ تقرر ہو گیا۔ تقریباً ایک سال بعد ان کا تبادلہ ترقی کے ساتھ ملتان کیا جارہا تھا، مگر وہ لاہور سے باہر نہیں جانا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے پوسٹ آفس کی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔ اس ملازمت کا زمانہ قدرے سکون کا تھا اور قدرے طویل بھی تھا اس لیے اس زمانے میں آزاد نے اپنی افتادِ طبع کے مطابق علمی کاموں کی طرف توجہ دی اور کچھ نہ کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے آزاد نے ایک کتابچہ 'آئینۂ صحت' کے نام سے لکھا جس کو وہ گورنمنٹ سے چھپوانا چاہتے تھے مگر وہاں سے نہ چھپ سکی اور نہ ہی بعد میں کبھی اس کی اشاعت کی نوبت آئی۔ اس طرح ان کی پہلی تصنیف اشاعت سے محروم رہی۔ محکمہ ڈاک سے مستعفی ہونے کے بعد آزاد مسلسل اس کوشش میں لگے رہے کہ انھیں محکمہ تعلیمات میں ملازمت مل جائے، مگر فوری طور پر انھیں ملازمت ملنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کا خیال ہے کہ ''شاید اسی لیے اس بات کے شواہد نہیں

ملتے کہ دسمبر 1862 سے جنوری 1864 تک انھوں نے کیا کیا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس وقفے میں آزاد نے پرانی کتابیں خریدنی اور ان کی حیثیت اور وقعت کے مطابق بہتر قیمت پر بیچنی شروع کردیں۔ اس طرح کا شغل مولوی محمد باقر نے بھی ایک زمانے میں اختیار کیا تھا اور دہلی کے پریس والی عمارت میں انھوں نے ایک حصہ نایاب اور کم یاب اشیا کو جمع کرنے اور ان کی تجارت کرنے کے لیے بھی چھوڑ رکھا تھا۔ آزاد نے اسی زمانے میں کشمیر کا بھی سفر کیا مگر اس کا مقصد سیر وتفریح کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے میر منشی پنڈت من پھول کا توسط اس زمانے میں آزاد کے کام آیا۔ پنڈت جی نے آزاد کی ملاقات کسی طرح اس وقت کے ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب میجر فلر سے کرادی۔ ان کے ساتھ پیارے لال آشوب نے بھی آزاد کی ان سے تعریف کردی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یکم فروری 1864 کو محکمۂ تعلیمات میں تقرر ہوگیا، اور ان کی تنخواہ پینتیس روپے ماہوار قرار پائی۔ اپنے مطلب کی ملازمت پانے کے بعد آزاد کو یک گونہ سکون ملا۔ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ علمی اور تدریسی کاموں میں مصروف ہوگئے۔ ان کی محنت اور جاں فشانی نے میجر فلر کو بھی ان کی صلاحیت اور اہلیت کا قائل بنا دیا۔
آزاد نے اسی زمانے میں قواعد عربی پر مبنی ایک کتابچہ تیار کیا اور اس کے بعد منطق کی ایک کتاب لکھنے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ میجر فلر کے جانے کے بعد پنجاب کے محکمۂ تعلیمات کے ڈائرکٹر کے طور پر کرنل ہالرائیڈ کا تقرر عمل میں آیا۔ انھوں نے جب آزاد کی صلاحیت اور کارکردگی کا اندازہ لگا لیا تو ان کو پنجاب کے سرکاری اخبار 'اتالیق پنجاب' کا نائب مدیر مقرر کردیا۔ ماسٹر پیارے لال اس وقت اس اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ کچھ دنوں کے بعد اسی اخبار کا نام 'پنجاب میگزین' ہوگیا۔ آزاد اس میگزین کے لیے بحیثیت نائب مدیر کام کرتے رہے۔ 1864 میں ہی آزاد کی پہلی باقاعدہ تصنیف 'نصیحت کا کرن پھول' مکمل ہوئی۔ یہ کتاب تعلیم نسواں کے موضوع پر تھی جس کی اشاعت بہت بعد میں عمل میں آئی۔

محمد حسین آزاد کو جس زمانے میں جگہ جگہ بھٹکنا اور طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا وہ زمانہ اندازاً 1857 اور 1864 کے درمیان کا تھا۔ جبکہ اسی زمانے میں آزاد کے دہلی کالج کے زیادہ تر ساتھی نہ صرف یہ کہ برسرروزگار ہو چکے تھے بلکہ بعض کو تو اہم عہدوں اور مناصب پر فائز

ہونے کا موقع مل چکا تھا۔ مولوی نذیر احمد ڈپٹی کلکٹر ہو چکے تھے اور مولوی ذکاء اللہ مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر کے عہدے پر مامور تھے۔ آزاد کو محکمہ تعلیمات سے وابستہ ہو کر علمی و ادبی سرگرمیوں کے باعث یک گونہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا مگر وہ اب بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''اکثر ذوق وشوق کا وقت تھا کہ سوسائٹیوں اور کمیٹیوں کے مضامین لکھنے میں گزر گیا۔ بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سررشتہ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انھوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔'' (مکتوباتِ آزاد۔ ص:95)

تاہم ان تمام باتوں کے باوجود ابھی لاہور میں محمد حسین آزاد کو جولانیِ طبع دکھانے کے اور بھی مواقع ملنا باقی تھے۔ بعد کے زمانے میں تعلیم و تدریس اور علمی پالیسی کے نقطۂ نظر سے ایک موڑ اس وقت آیا جب محسوس کیا گیا کہ لارڈ میکالے کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں قدیم علوم کو یکسر جدید اور مغربی علوم کے سامنے ثانوی حیثیت دینے کی ضرورت ہے اور یہ کہ مغربی علوم اور زبان کو ہندوستان میں پوری طرح رائج کر کے لوگوں کو اپنے سیاسی نظام کی تکمیل کا آلۂ کار بنانے پر ہمیں توجہ صرف کرنی چاہیے۔ یہ نقطۂ نظر بہت جلد ناکام ہو گیا۔ اس لیے انگریزوں کی پالیسی اب اس بات کی تھی کہ ہندوستان کے نظامِ تعلیم میں قدیم و جدید کے درمیان مفاہمت اور ہم آہنگی پیدا کر کے ہی لسانی اور علمی پالیسیاں کارآمد ہو سکتی ہیں۔ اب انگریز یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی مقامی زبانوں میں ایسے علم و ادب کی ترویج کی راہ نکالنی چاہیے جس میں ظاہر ڈھانچہ تو مشرقی ہو مگر اس میں مغربی افکار و نظریات کی روح سمائی ہوئی ہو۔ اس صورت حال میں ایسے اہلِ علم حضرات کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی جو نئے علوم کی تدریس و تحقیق میں معاون ثابت ہو سکیں۔ اس سلسلے کو فروغ دینے کے لیے ایک طرف کرنل ہالرائڈ کوشاں تھے اور دوسری طرف معروف مستشرق ڈاکٹر لائٹنر نے 2 رجنوری 1865 کو انجمن پنجاب قائم کی۔ کچھ ہی عرصہ قبل محمد حسین آزاد پنجاب کے محکمہ تعلیمات سے وابستہ ہوئے تھے۔ انھیں دنوں ان کی پہلی تصنیف شائع ہوئی اور ان کی ملاقات ڈاکٹر لائٹنر سے ہوئی۔ جب انجمن پنجاب قائم ہوئی تو

محمد حسین آزاد کو لائٹز نے پوری طرح ان کی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع فراہم کیے۔ چونکہ اس انجمن کے قیام کا مقصد مشرقی علم و حکمت کا احیا تھا، اس لیے دیسی زبانوں کے ذریعہ عوام کو معاصر تعلیم سے واقف کرانے کی سبیلیں نکالی گئیں۔ اس انجمن کے تحت ایک پبلک لائبریری اور ریڈنگ روم قائم کیا گیا۔ بہت سے تراجم شائع کیے گئے اور مصنفوں اور مترجموں کی حوصلہ افزائی کی خاطر ان کے انعام و اکرام کا بھی سلسلہ شروع کیا گیا — چند مہینوں تک محمد حسین آزاد نے اردو کے منشی کے طور پر ڈاکٹر لائٹز کے ساتھ کام کیا، جس کے سبب دونوں کے درمیان قریبی تعلقات قائم ہو گئے اور لائٹز کو آزاد کی ہر طرح کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا۔ پھر لاہور میں ہی ایک ادارے 'انجمن اشاعت علوم مفیدہ' کے نام سے بھی قائم ہوا۔ اس انجمن کا پلیٹ فارم آزاد کے لیے زیادہ کارآمد اور شہرت و مقبولیت کا ذریعہ بنا۔ انجمن کے جلسوں میں آزاد کے لکچر اور مضامین بے حد مقبول ہو رہے تھے۔ معلومات کا وفور، زبان اور اندازِ بیان کا سحر لوگوں پر طاری ہو جایا کرتا۔ اس درمیان کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ محمد حسین آزاد کی سرکاری ملازمت کا سلسلہ منقطع ہو گیا مگر انجمن نے اپنے یہاں لکچر دینے کی غرض سے انھیں باقاعدہ اعزازیہ کے ساتھ پیش کش کی۔ آزاد نے یہ پیش کش قبول کر لی اور انجمن کی سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ پھر انھیں دنوں انگریزوں نے محسوس کیا کہ افغانستان اور وسط ایشیا کے ممالک ان کے لیے دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ حکومت نے ایک جائزہ مشن ان ممالک کے دورے پر جانے کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔ اس زمانے میں لاہور میں آزاد کا دائرۂ اثر بڑھنا شروع ہوا تھا، وہ ہر وقت انجمن پنجاب کی ترقی کے لیے نئی نئی صورتیں نکالنے لگے تھے اور انجمن کی لائبریری کو مختلف لوگوں سے کتابیں حاصل کر کر کے بہت عمدہ ذخیرہ جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے، مگر جب وسط ایشیا کے لیے خفیہ مشن کی تیاری کا معاملہ درپیش ہوا تو پنڈت من پھول، منشی فیض بخش پشاوری اور کرم چند نندرام کے ساتھ محمد حسین آزاد کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔ 1857 کے معاملے میں مشتبہ ہونے کے سبب آزاد کی نفسیات یوں بھی خوف و ہراس سے عبارت تھی اس لیے وہ اس مشن پر جانے سے انکار تو کر ہی نہیں سکتے تھے۔

وسط ایشیا کے خفیہ مشن پر جانے کا مقصد اپنے مشاہدات اور حقیقی اطلاعات کی بنیاد پر

حکومت ہند کو رپورٹ پیش کرنی تھی کہ خوخند کے خان اور بخارا کے امیر کی اس شکایت میں کوئی صداقت بھی ہے یا نہیں کہ زار روس وسط ایشیا میں اپنے قدم جمانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس سفر سے پہلے ہدایت جاری کر دی گئی تھی کہ سب لوگ اپنا بھیس اور نام بدل کر ان علاقوں کا سفر کریں۔ اس سفر کی تفصیلات کو مختلف انداز میں بیان کی جاتی ہیں مگر محمد حسین آزاد نے اپنے سفر سے متعلق ایک درخواست میں جو باتیں لکھی تھیں وہ زیادہ معتبر ہیں:

> ''وسط ایشیا کے سفر کے دوران اٹھارہ مہینے تک ریگستان میں مارا مارا پھرتا رہا اور بعض اوقات میری جان بھی خطرے میں پڑ گئی۔ ان خدمات کے صلے میں مجھے مبلغ تین سو روپے کا انعام ملا اور سفر میں جو وقت لگا اس کے لیے سو روپے ماہوار کے حساب سے تنخواہ ملی۔''

آزاد کا یہ سفر 23/جولائی 1865 کو شروع ہوا تھا اور 27/مارچ 1866 کو ختم ہوا۔ کل آٹھ ماہ اور پانچ دن تک ان کو سفر کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ جب وہ کابل سے ہندوستان واپس آئے تو شکل سے پہچانے نہیں جاتے تھے۔ ان کی صورت درویشوں کی سی ہوگئی تھی۔ کپڑوں سے لے کر پورے جسم اور سر کے بالوں میں جوئیں ہی جوئیں تھیں۔ اس سفر میں آزاد پہلے ترکستان گئے، وہاں سے انھوں نے سمرقند کا سفر کیا اور وہاں سے ہوتے ہوئے تاشقند، جزاک، خجند اور چم کنت جیسی نامانوس جگہوں پر بھی گئے۔ اس کے بعد واپسی کے دوران انھوں نے قدرے لمبے عرصے تک بدخشاں میں قیام کیا اور آخر میں کافرستان ہوتے ہوئے 7/نومبر 1866 کو پشاور پہنچ گئے۔ اس دوران نام اور بھیس بدلنے کے سبب وہ طرح طرح کے تجربات سے گزرے، کبھی مشتبہ سمجھے گئے، کبھی گرفتار ہوئے اور چھوٹ گئے اور کہیں ان پر کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا اور قتل ہوتے ہوتے بچے۔ جاسوسی کا الزام تو ہر جگہ لگتا رہا۔ مگر تمام آزمائشوں سے وہ اپنے حسن تدبیر اور ذہانت کے سبب بچتے رہے۔ ان کی بعض کتابوں، ڈائریوں اور خطوط میں اس سفر کی روداد منتشر انداز میں مل جاتی ہے جس کو بعض لوگوں نے مرتب کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مگر بہت سے پہلو ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ محض مثال کے طور پر دریائے سیحوں کو عبور کرنے کے دوران پیش آمدہ تجربے کا بیان یہاں دلچسپی سے خالی

نہیں جس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب 'سخن دان فارس' میں کچھ اس طرح کیا ہے:

''زمین پر کمر بھر برف چڑھی تھی اور ادھر اُدھر پہاڑ برف سے سفید دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے ایک پتھر کی آڑ میں برف ہٹا کر زمین نکالی۔ ادھر اُدھر سے دو چار لکڑ گھسیٹ لائے۔ ان میں آگ سلگائی، بستر کر کے پڑے اور گٹھری ہو کر سکڑے رہے۔ غنیمت یہ ہے کہ رات کو ہوا بند ہوتی ہے۔ ہم گھنٹے دو گھنٹے بعد اُٹھ کر چائے بناتے، ایک ایک پیالی پی کر سینہ گرم کرتے اور پھر پڑ رہتے۔''

وسط ایشیا کے سفر کی واپسی کے بعد محمد حسین آزاد کو سفر کی رپورٹ اور اپنی کارکردگی کی تفصیل بتانے کلکتہ جانا تھا۔ کلکتہ اس وقت راجدھانی کی حیثیت رکھتا تھا۔ انھیں کلکتے میں انگریزوں کی شان و شوکت اپنے عروج پر نظر آئی۔ کلکتہ میں انھوں نے دہلی اور لاہور سے بالکل مختلف منظر دیکھا۔ مغرب کی نئی روشنی شہر کی ترقی کے ہر مظہر میں نمایاں تھی۔ وہاں کے قیام کے دوران انھوں نے کلکتہ کے اہلِ قلم حضرات سے ملاقات کی۔ کتب خانوں میں جا جا کر کتابوں کا ذخیرہ دیکھا۔ قدرے کم یاب کتابوں کی خریداری کی۔ سرکاری افسروں سے تو ان کو ملنا ہی تھا مگر وہ اپنے ذوق اور دلچسپی کے مراکز بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہاں کے اسکولوں کے ساتھ مدارس اور نصابِ تعلیم کا بھی جائزہ لیا۔ یہ سفر آزاد کے لیے محض چشم کشا نہ تھا بلکہ زندگی کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا کرنے والا بھی ثابت ہوا۔

تصنیفی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز:

محمد حسین آزاد وسط ایشیا کے سفارتی مشن پر روانہ ہونے سے قبل اپنے اہل و عیال کو اپنی سسرال دہلی چھوڑ گئے تھے۔ اس لیے سفر سے واپسی کے بعد پہلے تو وہ اپنے گھر والوں سے ملنے اور ان کی خبر گیری کرنے کی غرض سے دہلی گئے اور اس کے بعد کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ کلکتہ کی شہری فضا، ایک نئی دنیا کے ظہور اور انگریزوں کی بدولت رونما ہونے والی تبدیلیوں نے انھیں حد درجہ متاثر کیا۔ اس کا اندازہ ان کے اس لکچر سے بخوبی لگایا

جا سکتا ہے جو انھوں نے واپس آ کر انجمن کے جلسے 13 / مارچ 1867 کے جلسے میں دیا تھا۔ یہ لکچر تھا تو دراصل تعلیم سے متعلق مگر کلکتہ سے واپسی کے بعد وہ عرصے تک وہاں کے عام حالات اور علمی اداروں کے فروغ سے غیر معمولی طور پر متاثر رہے۔ اسی باعث بعد کے زمانے میں ان کے متعدد لکچرز اور تحریروں میں کلکتہ کے سفر اور وہاں کے حالات کا ذکر ملتا ہے۔ یوں تو آزاد کو کلکتہ کی شہری فضا، جدید ترقیات اور صنعتی فروغ نے بھی بہت متاثر کیا تھا مگر انھوں نے خصوصیت کے ساتھ اپنے لکچرز میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن، انجمن اسلام اور ایشیاٹک سوسائٹی کا ذکر کیا ہے۔ ان کے ایک لکچر میں کلکتہ کے کتب خانوں کا بھی تذکرہ تھا اور پبلک لائبریری کی تفصیلات بھی بتائی گئی تھیں۔ اس سلسلے میں تفصیلات تو خاصی دستیاب ہیں مگر یہاں اس تفصیل کا محل نہیں بس یہ بات زیادہ اہم ہے کہ وہ کلکتہ میں ایک سال سے زیادہ عرصے تک مقیم رہے، بلکہ مقیم کیا رہے کسی نہ کسی علمی، سماجی اور دانشورانہ پہلو کے مشاہدے میں مصروف رہے۔ اس طرح وسط ایشیا کے سفر کی صعوبتوں اور اذیتوں کے بعد کلکتہ کا یہ سفر ان کے لیے خاصا تازگی بخشنے والا اور ان کے ذہن اور حواس میں طرح طرح کے ارتعاشات پیدا کرنے والا تھا۔ کلکتہ کے سفر نے ایک طرح سے ان کے وسط ایشیا کے سفر کی تھکن اُتار دی اور ان کے وجود پر جمی ہوئی تکدر کی گرد کو جھاڑ کر انھیں تازہ دم کر دیا۔

وسط ایشیا کے سفر سے کچھ پہلے ان کی باقاعدہ ملازمت ختم ہو گئی تھی، اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اب جو وہ کلکتہ کے سفر سے واپس آئے تو سوائے اس کے ان کے پاس اور کوئی کام نہ تھا کہ وہ انجمن کی وابستگی کو قائم رکھیں۔ اس وابستگی کے عوض انھیں محض دس روپے ماہوار ملا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہفتے میں کالج کے دو طلبا کو الگ سے پڑھانے کے اندازاً تیس روپے مل جایا کرتے تھے۔ اس میں ان کا گزارا چل رہا تھا۔ وہ باقاعدگی سے انجمن کے جلسوں میں مضامین پڑھتے اور لکچر دیتے رہتے تھے۔ عام لوگوں کو بھی ان سے استفادہ کا موقع مل جایا کرتا تھا۔ اگست 1867 کو انھوں نے انجمن کے پلیٹ فارم سے اپنا وہ مشہور زمانہ لکچر دیا جس کا عنوان ''خیالات در باب نظم اور کلام موزوں'' تھا۔ یہی وہ لکچر تھا جو بعد کے زمانے میں انجمن اشاعت مفیدہ اور لاہور کے مناظموں کی فکری بنیاد بنا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سے اور بھی لکچر دیے جن میں سے

بیشتر کا تعلق اردو اور فارسی ادبیات اور اردو شاعری کی تاریخ سے تھا۔ شاہ حاتم، محمد رفیع سودا اور ہدایت وغیرہ سے متعلق لکچر کو ان کی بعد کی کتابوں میں بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ حاتم سے متعلق مضمون تو بعض تخفیف اور اضافے کے ساتھ پورا کا پورا آب حیات میں شامل ہے۔ انجمن کے لکچرز کے علاوہ آزاد کو اس زمانے میں درسی کتابوں کی تیاری کا بھی موقع ملا۔ ناظم تعلیمات مری میں درسی کتابوں کی تیاری اور ترکیب میں مشغول تھے۔ آزاد کی ذمہ داری تاریخ ہند لکھنے کے علاوہ ان کو تعاون دینا قرار دی گئی۔ یہ ایک طرح سے عارضی اور جزوقتی ملازمت بھی تھی۔ اس زمانے میں ناظم تعلیمات مسٹر پیرسن تھے۔ اس سلسلے میں سکریٹری گورنمنٹ پنجاب کا ایک انگریزی خط دستیاب ہے جس میں اس نے لیفٹیننٹ گورنر کی اجازت ملنے کا ذکر کرتے ہیں کہ ''محمد حسین آزاد کو عارضی طور پر پچھتر روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا جائے تاکہ وہ ایک 'نئی تاریخ ہند' کی ترتیب اور محکمۂ تعلیمات کے دوسرے کاموں کے لیے مسٹر پیرسن کی اعانت کریں۔'' اس ضمن میں گارساں دتاسی نے اپنے 1868 کے ایک خطبے میں اس واقعہ کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''مسٹر پیرسن جو حلقۂ راولپنڈی کے انسپکٹر تعلیمات ہیں، اردو میں ایک تاریخ ہند لکھنا شروع کیا ہے۔ موصوف ایک مسلمان فاضل سے بھی اس ضمن میں مدد لے رہے ہیں جو اپنی طرز تحریر اور انشاپردازی میں شہرت رکھتا ہے۔''

پیرسن کے ساتھ اور نئی تاریخ ہند اور درسی کتابوں کی تدوین کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیرسن محمد حسین آزاد کی غیر معمولی صلاحیتوں کے بڑے قائل ہوگئے۔ اس کے بعد ہی وہ سرکاری اخبار کے سب ایڈیٹر مقرر کردیے گئے۔ تاہم اس ملازمت کے ساتھ بھی انھوں نے انگریزوں کو اردو پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

مولانا محمد حسین آزاد کی اس زمانے کی تحریروں میں اردو اور فارسی کی ریڈریں ہیں، آغا محمد باقر نے نقوش شخصیات نمبر میں بڑی وضاحت سے آزاد کی مرتب کردہ ریڈروں کا ذکر کیا ہے: ''1867-68 تک مولانا بچوں کے لیے اردو کی ریڈریں تیار کرتے رہے۔'' آزاد کی تیار کردہ ریڈریں صرف پنجاب میں ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں غیر معمولی طور پر مقبول ہوئیں، مگر چونکہ ان پر مولانا آزاد کا نام لکھا ہوا نہیں ہوتا تھا اس لیے کچھ عرصے کے بعد لوگ

بھولنے لگے کہ ایسی سادہ، پرکار اور کارآمد ریڈریں مولوی محمد حسین آزاد کی تیار کردہ ہیں۔ ان ریڈروں پر پنجاب کے ناظم تعلیمات کرنل ہالرائیڈ کا نام چھپا کرتا تھا، اور یہ عبارت لکھی ہوتی تھی ''مرتبہ، کرنل ہالرائیڈ ناظم تعلیمات پنجاب، بہ اعانت ملکی علما'' — حافظ محمود خاں شیرانی نے تنقید آبِ حیات میں آزاد کی تیار کردہ ریڈروں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''بچپنے میں مجھے ان کی پیاری تالیفات اردو کی پہلی، دوسری اور تیسری اور چوتھی ریڈر کے سامنے زانوے ادب تہہ کرنا پڑا۔ آج کل کے بچے کس قدر بدنصیب ہیں جو ان غیر فانی کتابوں سے محروم کر دیے گئے ہیں۔''

1868 میں پنجاب کے ناظم تعلیمات نے اعلان کیا کہ اکتیس مارچ کو اردو میں تصانیف کا مقابلہ ہوگا۔ اس مقابلے کے لیے چار موضوعات کا تعین کیا گیا:

(1) عام اصول صرف ونحو
(2) فارسی صرف ونحو
(3) تاریخ ہند سے ماخوذ کہانیاں اور
(4) اقلیدس کے کسی حصے کا ترجمہ

اس مقابلے کے لیے پہلی شرط تو یہ رکھی گئی تھی کہ لکھنے والے کی زبان سادہ اور عام فہم ہونی چاہیے اور فارسی محاورات سے پرہیز کیا جانا چاہیے، اور یہ کہ ناظم تعلیمات کو یہ حق حاصل ہوگا کہ جو کتاب پسند کی جائے گی اس کی اشاعت بھی حکومت کی طرف سے کر دی جائے گی — اس اعلان کے جواب میں آزاد نے ہندستانی قصوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس کا نام قصص الہند رکھا، مگر جب وہ شائع ہوئی تو کتاب کے نام کے ساتھ قصص الہند، حصہ دوم بھی لکھا ہوا تھا۔ اب یہ اندازہ نہیں کہ اس سے قبل اس کتاب کا حصہ اول کس نے لکھا تھا اور آیا وہ حصہ شائع ہوا یا نہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ اس کتاب کی پہلی اشاعت پر محمد حسین آزاد کا نام شروع میں چھپا تھا مگر اس کے بعد کی اشاعتوں سے ان کا نام غائب کر دیا گیا۔

قصص الہند کے ساتھ اس مقابلے کے لیے آزاد نے فارسی قواعد بھی مرتب کی جس پر ان کو دوسو روپے کا انعام ملا۔ پھر اس کے بعد دختر کشی کے خلاف ان کے بہت عمدہ مضمون پر بھی

انھیں دو سو روپے کے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس بات کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر سے محمد حسین آزاد کے مراسم صرف رسمی یا دفتری نہیں تھے۔ لائٹنر، آزاد کے بے حد قائل ہو گئے تھے اور محمد حسین آزاد بھی ان کی عزت کرتے تھے مگر عزت کے ساتھ ان کی نازک مزاجی کے باعث ان کی ناز برداری بھی کیا کرتے تھے کہ اس کے علاوہ ان کے ساتھ کام کرنے میں کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ انھی دنوں یعنی 1869 کے ابتدائی مہینوں میں ڈاکٹر لائٹنر کے چھٹی لے کر انگلستان جانے کی خبر عام ہوئی۔ بالآخر ان کو رخصت ملی اور جانے کا وقت آیا تو ان کو عارضی طور پر الوداعیہ دیا گیا۔ اس الوداعیہ میں آزاد نے ان کو ایک سپاس نامہ پیش کیا جس میں محض اپنے دلی جذبات اور ان کی کارکردگی کا ذکر نہ تھا بلکہ ڈاکٹر لائٹنر کی افسرانہ کارکردگی، محنت و جاں فشانی، ذہانت و فطانت اور خلوص و محبت کو نہایت جذباتی انداز میں خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر چونکہ ایک اہم اور اعلیٰ مرتبت مستشرق تھے اور مشرقی علوم، زبانوں اور تاریخ سے ان کو غیر معمولی طور پر واقفیت ہی نہیں دسترس بھی حاصل تھی۔ اس لیے کہ آزاد نے اپنے سپاس نامے میں اشارتاً اس طرح کی تمام چیزوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی عارضی رخصت کو ایک بڑا نقصان بتایا تھا۔ ان کے سپاس نامے کے بعض چیدہ چیدہ حصوں سے اس پورے سپاس نامے کی اہمیت اور آزاد کی سحر انگیز انشا پردازی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> ''ہم آپ کی کون کون سی بات کو یاد کریں اور کیا کیا احسانات کا بیان کریں۔
> اگر یہ کہیں کہ پانچ برس کے عرصے میں آپ نے لاہور کالج کی پرنسپل شپ کا حق
> خوب ادا کیا تو کیا بڑی تعریف ہوئی کہ اکثر ملازم سرکاری اپنا غرض پورا کرتے
> ہیں، اگر کہیں کہ آپ کے طلبا نے ترقی کی ہے تو مدرس کا کام یہی ہے۔ انصاف
> یہ ہے کہ آپ نے نہ فقط شاگردوں کو بلکہ تمام پنجاب کو سکھایا اور کر دکھایا کہ
> انسانیت اور مروّت کیا شے ہے اور بامروّت انسان کو کیا کرنا چاہیے۔''

> ''ہمارے قدیم علوم کیا عربی، کیا سنسکرت، چراغ سحری ہو گئے تھے، آپ نے
> کہ روشن ضمیر اسم با مسمیٰ ہیں، بجھے بجھے ہوئے چراغوں کو اس طرح روشن
> کیا ہے کہ چند روز میں سارے ہندوستان کو روشن کر دیں گے۔''

''آپ کی شفقت اور نیکیوں کے نقش دل پر کندہ ہیں، مرتے وقت تک دلوں سے نہ بھولیں گے ــــ افسوس کہ آپ کی رخصت کا مضمون ہم کو لکھنا پڑا۔ کاش قلم ٹوٹ جاتا اور زبان بند ہوجاتی ــــ مگر اس داستانِ غم کو دعا پر ختم کرتے ہیں۔''

محمد حسین آزاد کا درسی کتابیں لکھنا، انجمن کے پلیٹ فارم سے لیکچر دینا اور مختلف اور طریقوں سے اپنی اہلیت کے مواقع کو رائیگاں نہ جانے دینا، یہ تمام ایسی باتیں تھیں جن کے باعث علمی اور سماجی طور پر ان کی حیثیت روز بروز مستحکم ہوتی جارہی تھی۔ آزاد کی علمی اور ادبی کاوشوں کا اظہار یوں تو اردو کے حوالے سے ہوا تھا مگر ان کی عربی اور فارسی کی صلاحیت کسی سے مخفی نہ تھی۔ پھر یہ کہ وہ دلّی کالج کے فارغ التحصیل لوگوں میں تھے اور اپنے ساتھیوں میں بھی ان کا امتیاز مسلّم تھا۔ لاہور کے لوگوں کو بھی ان کی عربی اور فارسی دانی کا تجربہ ہوتا رہتا تھا۔ اس لیے جب گورنمنٹ کالج لاہور کے عربی کے استاد مولوی علم دار حسین 1869 میں علالت کے سبب تین مہینے کی رخصت پر گئے تو ان کی جگہ تین مہینے کے لیے آزاد کی خدمات بہ عوض پچھتر روپے ماہوار کالج میں منتقل ہوگئیں۔ ان کی زندگی کا یہ پہلو پہلی بار ان کے لیے پوری طرح اطمینان اور آسودگی بخشنے والا تھا پھر اتفاق یہ ہوا کہ مولوی علم دار حسین 14 مئی 1870 کو اپنی علالت سے جاں بر نہ ہوسکے تو محمد حسین آزاد کو عربی کے استاذ کے عہدے پر مستقل طور پر کل وقتی استاذ بننے کا شرف حاصل ہوگیا۔ گورنمنٹ کالج کی ملازمت نے ان کو معاشی اور مالی طور پر خاصا مطمئن کردیا۔ اس ملازمت کے زمانے میں آزاد ایک اخبار 'ہمائے پنجاب' بھی مرتب کرنے لگے، جس کے عوض ان کو ایک سو پچاس روپے مزید ملنے لگے۔ مگر اس اخبار کی ادارت کا سلسلہ زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکا اور منشی محمد لطیف کو اس اخبار کا ایڈیٹر مقرر کردیا گیا۔ دراصل ہوا کچھ یوں کہ اس اخبار میں پنجاب کے محکمہ ڈاک سے متعلق ایک رپورٹ شائع ہوئی جس کے سلسلے میں آزاد کو ذمہ دار قرار دیتے ہوئے اس کا جواب طلب کیا گیا۔ مگر آزاد سے اس کا کوئی معقول جواب نہ بن پڑا۔ ڈاکٹر لائٹنر جو رخصت لے کر ولایت چلے گئے تھے اس دوران واپس آگئے تھے۔ لائٹنر کے آزاد سے تعلقات نہایت خوش گوار

چلے آ رہے تھے مگر ایک تو لائٹز کے مزاج میں تندی کو سنبھالنا مشکل تھا اور دوسرے یہ کہ آزاد کی ترقی، شہرت اور مقبولیت کے فروغ نے ان کے بہت سے دشمن بھی پیدا کر دیے تھے۔ اس طرح کے لوگ لگا تار لائٹز کے کان بھرا کرتے اور ان کو محمد حسین آزاد سے بدگمان کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ 'ہمائے پنجاب' کی خبر سے متعلق قضیہ چل ہی رہا تھا کہ ستم بالائے ستم یہ تھا اس زمانے میں لائٹز کی بدگمانی آزاد سے شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ جب انھوں نے اس وقت کی صورت حال کو بھولنے کی غرض سے کچھ دنوں کے لیے لاہور سے باہر جانے کا ارادہ کیا تو خود ڈاکٹر لائٹز نے ان کی درخواست مسترد کر دی۔

محمد حسین آزاد نے ڈاکٹر لائٹز کے دل میں اپنے لیے جو جگہ بنائی تھی اس میں 'سنین اسلام' کی جلد اوّل کے سلسلے میں آزاد کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ یہ کتاب تھی تو دراصل ڈاکٹر لائٹز کے پروجیکٹ کا حصہ، مگر آزاد نے بحیثیت معاون کے لائٹز کا ہاتھ بٹایا تھا۔ کتاب پر تو آزاد کا نام نہ آنا تھا جو نہ آیا مگر اس کی ترتیب میں آزاد نے اپنی جان لڑا دی۔ پھر بھی 'سنین اسلام' کی تیاری میں بڑا حصہ ڈاکٹر لائٹز کا ہی تھا۔ اس لیے کہ وہ اپنے عہد کے ایک ممتاز عالم اور مستشرق تھے۔ کتاب کو پڑھ کر بھی اس بات کے شواہد نہیں ملتے کہ پوری کتاب آزاد کی لکھی ہوئی ہے، جیسا کہ بعض لوگ مشہور کر رہے تھے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر لائٹز نے مسلمانوں کی علمی و ادبی تاریخ بیان کی ہے اور مزید برآں یہ کہ تاریخ عالم میں مسلمانوں کی علمی و ادبی خدمات کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دراصل ان کی انگریزی کتاب کو اردو میں منتقل کرنے کا کام آزاد نے انجام دیا تھا، اس لیے کہ اردو زبان میں ان کی انشا پردازی اور اہلیت کا لوگ لوہا مان چکے تھے۔ تاہم بعد کے زمانے میں بعض لوگوں کا یہ مشہور کرنا درست نہیں معلوم ہوتا کہ یہ آزاد کی تصنیف تھی جسے ڈاکٹر لائٹز نے اپنے نام سے چھپوالیا۔ ایک سبب تو یہ ہے اس کتاب میں تاریخ عالم سے متعلق ایسے گہرے اور بلیغ اشارے ملتے ہیں جہاں تک آزاد کی رسائی آسان نہ تھی، دوسرے یہ کہ سنین اسلام میں تاریخی واقعات کے بیان میں جس حد تک معروضیت ملتی ہے وہ معروضیت آزاد کے مزاج کا حصہ نہیں تھی۔ وہ قصص ہند اور دربار اکبری تک میں جگہ جگہ جانب دار اور غیر معروضی ہونے کا ثبوت دینے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے۔ لیکن یہ تو

رہیں ضمنی باتیں۔ اصل قضیہ سنین اسلام کا اس وقت شروع ہوا جب اس کی دوسری جلد پر کام کرنے کی نوبت آئی۔ دوسری جلد کے لیے لائٹز نے ضروری مواد اور نوٹس محمد حسین آزاد کے حوالے کر دیے تھے اور چاہتے تھے کہ جلد اوّل ہی کی طرح بڑی سرعت کے ساتھ دوسری جلد کا کام بھی مکمل کر دیا جائے۔ مگر آزاد نے دوسری جلد کی ترتیب و تکمیل میں زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ لائٹز کے بار بار کے تقاضے کے باوجود انھوں نے اس کام سے بے توجہی کا انداز روا رکھا۔ اس کا اندازہ اس نوٹ سے ہوتا ہے جو تیسری یاد دہانی کے طور پر لائٹز نے آزاد کو لکھوا بھیجا تھا۔ اس نوٹ کے بعض جملے اس طرح تھے:

> ''ڈاکٹر لائٹز شکر گزار ہوں گے اگر مولوی محمد حسین سنین اسلام کے متعلق تمام کاغذات مزید کسی تاخیر کے بغیر واپس کر دیں گے۔ ان کی خواہش ہے کہ اندلس، مصر اور مراکش میں عربوں کی تاریخ کا تمام تحریر شدہ مواد واپس کر دیا جائے۔ ہندوستان اور ایران میں مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق مولوی کو اختیار ہے، جو چاہے کریں، لیکن ڈاکٹر لائٹز باقی چیزوں کی واپسی پر مصر ہیں۔''

شاید یہ خط اس بات کی شہادت کے لیے بھی کافی ہے کہ لائٹز اپنے زیادہ تر نوٹ خود تیار کرتے تھے اور آزاد سے ان پہلوؤں پر تعاون حاصل کرتے تھے جو آزاد کے دائرۂ معلومات کا حصہ ہو سکتے تھے۔ بہر کیف سنین اسلام کی دوسری جلد کی تکمیل میں ہونے والی تاخیر کے سبب ہی باقاعدہ طور پر لائٹز صاحب سے محمد حسین آزاد کے تعلقات بڑی حد تک خراب ہو گئے۔ تاہم اس شکر رنجی کے علاوہ وہ زمانہ آزاد کی پُرسکون زندگی کا زمانہ ثابت ہو رہا تھا۔ آزاد اورینٹل کالج کی پروفیسری میں مصروف اور مگن تو تھے ہی مگر اس کے ساتھ ہی ان ہی دنوں آزاد نے اپنی مشہور کتاب 'سخن دانِ فارس' لکھی، جس کا اندازہ اس کے سنِ اشاعت سے بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق کا خیال ہے کہ آزاد کی کتاب 'نگارستانِ فارس' بھی اسی زمانے کی تصنیف ہے۔

1879 میں جب چند سال اور گزر گئے ـــــ کالج کے ساتھ محکمہ تعلیم کی وابستگی کے سبب محمد حسین آزاد کو مختلف خدمات انجام دینا پڑتی تھیں، انہی دنوں محکمہ تعلیمات نے انھیں ہدایت کی کہ راولپنڈی جا کر مسٹر پیرسن کی زیرِ نگرانی فارسی کی قواعد تیار کریں۔ جس کو بعد میں محکمہ

تعلیمات نے ہی شائع کیا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر لائٹز عارضی طور پر ناظم تعلیمات مقرر کرد. یے گئے جس سے آزاد کی الجھنوں میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوگیا۔ چونکہ وہ گورنمنٹ کالج میں پہلے سے درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے اس لیے راولپنڈی سے واپس آکر بھی تدریس کے کام میں مصروف ہوگئے۔ اب تو آزاد لائٹز صاحب کی موجودگی کو اپنے لیے سوالیہ نشان مان ہی چکے تھے اور چونکہ یہ بات ان کے معمولات کا حصہ بن چکی تھی، اس لیے وہ اپنے بڑے علمی منصوبوں میں بھی مصروف رہا کرتے تھے۔ بس اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بعض ذہنی الجھنوں اور بدخواہوں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود ان کا علمی کام بھی نقطۂ عروج پر رہا۔ 1880 سے پہلے پہلے انھوں نے 'آبِ حیات' جیسی معرکہ آرا کتاب مکمل کرلی اور نیرنگ خیال کے مضامین بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے۔ آبِ حیات 1880 میں شائع ہوکر منظرِ عام پر بھی آگئی۔ اس کے بعد نیرنگ خیال بھی شائع ہوگئی۔ جب آزاد کی ان کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے تو کچھ دیانت دارانہ طور پر اور کچھ مخاصمانہ انداز میں ان کتابوں پر معترضین کی رائیں بھی سامنے آئیں — گویا آبِ حیات پر خاصا شدید ردِعمل ہوا۔ جن شاعروں کو آزاد نے اردو شعرا کے اس تذکرے میں جگہ نہیں دی تھی یا جن کو ذوق پرستی کی شدت میں کم تر گردانا گیا تھا، ان کا نمایاں ذکر کیا گیا اور آزاد کو اس ضمن میں موردِ الزام گردانا گیا۔ سامنے کی مثالوں میں ایک نمایاں مثال مومن خاں مومن کی تھی جن کو 'آبِ حیات' میں قابلِ ذکر بھی نہیں سمجھا گیا تھا اور دوسری مثال مرزا غالب کی، کہ ان کو ان کے درجے اور مقام سے کم تر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ قدرے بعد کے زمانے میں آزاد نے جب 'آبِ حیات' کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اس میں بعض اضافے اور تحریفات کے ذریعہ بہت سے اعتراضات کے مثبت ردِعمل کا ثبوت فراہم کیا۔ 1880 سے 1882 کے درمیان بھی محمد حسین آزاد پوری طرح اپنی تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ تدریس کا کام علی حالہ جاری رہا۔ 'دربارِ اکبری' کا خاکہ اور مسودہ بھی اسی زمانے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا اور آبِ حیات اور نیرنگ خیال کے دوسرے ایڈیشن کو نظرثانی اور بعض تبدیلیوں کے ساتھ مکمل کرلیا گیا۔

OOO

انجمن پنجاب اور جدید نظم کی سرگرمیاں

محمد حسین آزاد کے علمی اور ادبی کارناموں میں ان کی بعض معروف کتابوں، درسی کتابوں اور لکچرز کو جو اہمیت حاصل ہے ان سے قدرے زیادہ اہم کارنامہ نظم اردو سے متعلق ان کی کاوشوں کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ نظم اردو سے متعلق ان کے لکچرز ہوں یا وہ مناظمے جو محمد حسین آزاد کی نگرانی میں منعقد کیے جانے لگے تھے اس کے اسباب وعوامل گوناگوں تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ انگریز حکام کے لیے اردو کے پورے شعری ادب کا روایتی غزل گوئی کے زیراثر ہونا ان کے لیے خاصا غیراطمینان بخش تھا۔ دوسری بات یہ کہ پنجاب کے سرکاری اسکولوں کے لیے جو کتابیں تیار کی گئی تھیں انھیں دیکھ کر لیفٹیننٹ گورنر کو یہ اعتراض تھا کہ ان درسی کتابوں میں نظموں کا فقدان ہے۔ ظاہر ہے اس سے ایک تو ان کا نظمیہ شاعری سے حد سے زیادہ مانوس ہونا ظاہر ہوتا تھا دوسرے یہ کہ وہ پورا زمانہ انگریزی میں رومانی شاعری بالخصوص رومانی نظموں کے فروغ کا تھا۔ انگریزی کی رومانی نظموں میں جہاں تمثیلی اور علامتی رجحان کی کارفرمائی تھی وہیں عام سوجھ بوجھ کے لوگوں کے لیے بھی دلچسپی کا سامان ضرور موجود ہوا کرتا تھا۔ اس اعتبار سے وہ عام فہم اور فطری مظاہر ومناظر پرمبنی زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ انگریز حکام چونکہ ہندستان کو اپنے زیرنگیں کرنے کے بعد جس طرح دوسرے تمام معاملات میں اپنی

تہذیب، اپنے رویوں اور اپنے طرزِتعلیم کی تقلید کی طرف توجہ دلا رہے تھے اسی طرح انھوں نے شعروادب میں بھی انگریزوں کے اثرات کو بڑھانے کی طرف توجہ مبذول کرنا شروع کردی تھی۔ اس پورے پس منظر میں اگر انیسویں صدی کے آخری تین چار عشروں میں پروان چڑھنے والے انگریزی اثرات کا سیاق وسباق متعین کیا جائے تو اس عہد کی علمی، تہذیبی اور شعری وادبی سرگرمیوں کے اغراض ومقاصد کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔

1874 کا سال اسی اعتبار سے محمد حسین آزاد کے لیے اور ان کے حوالے سے اردو کے شعری رجحان کے لیے ایک اہم اور یادگار سال قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ اسی سال جدید نظم گوئی کو فروغ دینے کی غرض سے محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے ایک بہت اہم لکچر دیا تھا اور اسی کے بعد روایتی مشاعروں کے برخلاف ایسے مشاعروں کی داغ بیل ڈالی گئی جن میں شعر یا غزل سنانے کے بجائے مخصوص موضوعات پر نظمیں لکھنے اور سنانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ دراصل معاملہ یہ تھا پنجاب کے سرکاری مدارس میں اردو کی جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور خود آزاد نے اردو کی جو ریڈریں تیار کی تھیں، ان سب کو دیکھ کر لیفٹیننٹ گورنر نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ ان کتابوں میں یا تو نظموں کا حصہ بہت کم ہے یا پھر نظموں پر زیادہ توجہ ہی نہیں دی گئی ہے، اس لیے پنجاب کے ناظم تعلیمات کرنل ہالرائیڈ کے مشورے سے ایک ایسی تحریک شروع کی جائے جس کے نتیجے میں نظری طور پر نظم نگاری کی ضرورت کو محسوس کیا جائے اور عملی طور پر اس وقت کے شعرا کچھ مخصوص موضوعات پر اس انداز کی نظمیں لکھنی شروع کریں کہ ان میں انگریزی میں رائج نظموں کے انداز کو اپنایا جائے۔ اس طرح کرنل ہالرائیڈ صحیح معنوں میں اس تحریک کے محرک بنے اور انھوں نے اس کام کی قیادت کے لیے محمد حسین آزاد کو سب سے زیادہ موزوں شخص پایا۔ اس لیے انھوں نے آزاد کو اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے آمادہ کرلیا۔ واضح رہے کہ انجمن کی سرگرمیوں کے آغاز کے زمانے میں کچھ آزاد نے بھی اپنے زمانے کی ہوا کو محسوس کرنا شروع کردیا تھا اسی باعث محمد حسین آزاد 1867 میں ہی کلام موزوں اور نظم گوئی پر ایک تفصیلی لکچر پیش کرچکے تھے۔ اس لکچر میں انگریزی نظموں کی تقلید اور حد سے بڑھی ہوئی اردو کی رومانی انداز کی

شاعری سے متعلق مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی گئی تھی۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے اجمالی طور پر انجمن پنجاب کے قیام کے اغراض و مقاصد کا ایک اجمالی خاکہ پیش کر دیا جائے تا کہ اندازہ لگایا جا سکے کہ دوسری اور سماجی معاملات اور اصلاحات کے ساتھ اس انجمن کے مقاصد میں لسانی اور ادبی اصلاحات کو بھی خاصی اہمیت کیوں حاصل تھی۔ اسی باعث انجمن پنجاب کو شروع شروع میں صرف ''انجمن اشاعت علوم مفیدہ، پنجاب'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس انجمن کے قیام کے ساتھ ہی تعلیمی ماحول سازی کی سرگرمیاں تیز ہوگئی تھیں، عوام کے لیے لائبریریاں قائم کی گئیں، اخبار و رسائل جاری کیے گئے اور سماجی، تہذیبی، علمی اور ادبی موضوعات پر اظہار خیال کے لیے جلسوں کا اہتمام کیا جانے لگا۔ انجمن پنجاب کی سرگرمیاں لاہور کی حدوں سے نکل کر امرتسر، گورداس پور، قصور، راولپنڈی اور دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئیں۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد کے فروغ کے لیے ایک رسالہ ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ، پنجاب'' کے نام سے جاری کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں 27/مارچ 1867 کے اجلاس میں محمد حسین آزاد کو انجمن کے تین عہدے سونپے گئے۔ یہ اجلاس ڈاکٹر لائٹز کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس کی روداد کا متعلقہ حصہ یہ تھا:

> ''جناب صدر نے فرمایا کہ مولوی محمد حسین آزاد کو اگر سکریٹری انجمن کا مقرر کیا جاوے تو یقین ہے کہ انجمن کی بہت رونق اور ترقی ہوگی۔ ترتیب، رسالہ انجمن اور کام، یونیورسٹی کا بھی ان کے متعلق ہوگا۔''

انجمن پنجاب کے مقاصد اور دائرۂ کار میں جو باتیں بھی شامل تھیں، وہ برطانوی حکومت کی پالیسیوں کے عین مطابق تھیں۔ پنجاب کی حکومت کی سرکاری دستاویز سے اندازہ ہوتا ہے کہ انجمن کی سرگرمیوں کو شروع سے ہی سرکاری سرپرستی حاصل تھی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سیاسی اور سماجی طور پر انجمن پنجاب کا قیام اور اس کی کارکردگی حکومت کی مخصوص منصوبہ بندی کا حصہ تھی۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہ تھا کہ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر رونالڈ میکلوڈ انجمن کے معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے اور یہ باور بھی کرا دیا کرتے تھے کہ ان کو ان تمام معاملات سے ذاتی دلچسپی ہے۔ مشرقی علوم کی ترویج کا معاملہ ہو یا دیسی زبانوں میں تعلیم دے کرنے

خیالات کو عام کرنے کی بات، یہ دونوں چیزیں ان کی ترجیحات میں شامل تھیں۔ یہی وہ سارے اسباب تھے کہ باقاعدہ طریقے پر مناظموں یا نظموں کے مشاعرے کا سلسلہ تو 1874 میں شروع ہوا مگر 27 مارچ 1867 کو انجمن میں محمد حسین آزاد نے نظم اور کلامِ موزوں پر جو تمہیدی باتیں کہی تھیں ان میں شامل ذیل کی باتیں ان کے آگے کے عزائم اور اردو نظم کی اصلاح کے مسئلے پر پوری طرح مرکوز تھیں:

''اے میرے اہلِ وطن آؤ، آؤ، برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔ اُٹھو، وطن اور اہلِ وطن کی قدیمی ناموری کو بربادی سے بچاؤ۔ تمھاری شاعری چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہورہی ہے۔ اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو، نہیں تو ایک زمانہ تمھاری اولاد، ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہوگی اور اس فخر آبائی اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا پڑے گا، یہ افسوس کا مقام ہے ــــ اے خاک ہندستان! اگر تجھ میں امرالقیس نہیں تو کوئی کالی داس ہی نکال۔ اے ہندوستان کے صحرا و دشت! فردوسی نہیں تو کوئی والمیک ہی پیدا کردو۔''

''میں نے آج کل چند نظمیں مثنوی کے طور پر مختلف مضامین میں لکھی ہیں جنھیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہوتا ہوں اور ایک مثنوی جو رات کی حالت پر لکھی ہے، اس وقت گزارش کرتا ہوں۔ اہلِ نظر یہ بھی دیکھیں گے کہ آزادگی آزاد نے اس میں کس قسم کی قیدوں کو توڑا ہے ــــ''

آزاد کی یہ تقریر لیفٹیننٹ گورنر صاحب کی منشا کے عین مطابق تھی۔ اس لیے کہ آزاد کے لکچر اور ان کی 'رات سے متعلق' نظم کے بارے میں اپنی تقریر میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور بتایا کہ انجمن اگر اردو شاعری کی اصلاح کا ارادہ رکھتی ہے تو یہ مقصد آزاد کے لکچر سے پوری طرح واضح ہے اور آزاد نے جو نظم سنائی، اس نوع کی نظموں کو فروغ دینا ہمارے مقاصد میں شامل ہے۔ 1867 کے لکچر کے بعد یوں تو پابندی سے انجمن پنجاب کے جلسے منعقد ہوتے رہے اور ہر جلسے میں انجمن کے خاصے پھیلے ہوئے اغراض و مقاصد سے متعلق لکچر دیے جاتے

رہے۔ اس درمیان بھی یوں تو اردو شعروادب زیر بحث آتا رہا اور اردو کی شاعری کی رسمی، روایتی اور غیر حقیقی صورت حال کو بدلنے کی طرف اشارے کیے جاتے رہے مگر مربوط اور منضبط انداز میں یہ گفتگو 1874 کے لکچر میں سامنے آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی عملی کارگزاری کے طور پر نظموں کو بھی مشاعرے کی صورت میں پیش کیے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ نظموں کے ان مشاعروں کو عموماً مناظمے کا نام دیا گیا اور ہر اگلے مناظمے کے لیے پہلے سے کچھ موضوعات طے کردیے جاتے تھے جن کو شعرا اپنی اپنی نظمیں پیش کیا کرتے تھے۔ اس سے قبل کے بعض مناظموں کے لیے منتخب موضوعات کا ذکر کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محمد حسین آزاد نے 9/اپریل 1879 کے اپنے لکچر میں جو باتیں کہیں ان میں سے بعض پر آپ بھی ایک نگاہ ڈال لیں:

> ''...اے گلشنِ فصاحت کے باغ بانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغے اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اُڑے، قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے، لفاظی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہوگئے...... ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بہ موجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اصلیت بھاشا سے سیکھیں، لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں...... ہماری نظم خالی ہاتھ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے، لیکن اب بھی وہ منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے۔''

جب مولانا محمد حسین آزاد کی اس تقریر کا اختتام ہوا تو انھوں نے اپنی نظریاتی باتوں کی دلیل اور مثال کے طور پر اپنی مثنوی 'شب قدر' پیش کی۔ یہ مثنوی ایک سو پندرہ اشعار کی تھی۔ اس نظم یا مثنوی کو اس نئی نظم نگاری کے آغاز سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ محمد حسین آزاد نے اپنی تقریر میں اردو غزل پر جو تنقید کی تھی اور جدید نظم کی حمایت میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کو انجمن پنجاب کے مشاعروں کی کلید تصور کیا جانا چاہیے۔ چونکہ انگریز حکمرانوں کے ذہنوں پر انگریزی کی نظمیہ شاعری چھائی ہوئی تھی اس لیے ان کی خواہش تھی کہ انگریزی ہی

کے انداز کی نظم نگاری کو اردو میں بھی فروغ حاصل ہو۔ وہ اردو میں غزل گوئی کے ماحول کو خیالی، رومانی، غیر حقیقی رجحان کے رائج ہونے کا نام دیتے تھے۔ اس پس منظر کے سبب انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے پیش کیے جانے والی نظموں کو پوری طرح انگریزی اثرات کو قبول کرنے اور ان کو عملی طور پر روبہ عمل لانے کا نام دیا جاسکتا ہے۔ انجمن کے مشاعروں میں کبھی کبھی بعض غزلیں بھی پیش کی جاتی تھیں مگر اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ مبالغہ آرائی سے اجتناب برتا جائے اور حزن و یاس اور قنوطیت کے بجائے رجائیت اور حقیقت پسندی کے رجحان کو عام کیا جائے۔ اس لیے کہ بقول رام بابو سکسینہ:

> ''اس انجمن کے قیام کی خاص غرض یہ تھی کہ اردو شاعری میں جو تشبیہ و استعارہ کی افراط اور مبالغہ کا طوفان برپا ہے اس سے اب اردو کے شعرا پرہیز کریں۔ مزید یہ کہ شاعروں میں جو طریقہ مصرع طرح دینے کا رائج ہے وہ موقوف کیا جائے اور بجائے اس کے شعرا خاص خاص مضامین وعنوان پر طبع آزمائی کریں۔''

کرنل ہالرائیڈ چونکہ اس جلسے کے محرک تھے اور محمد حسین آزاد کے وسیلے سے وہ آزاد کی تقریر کو ایک تحریک میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے 9/اپریل 1873 کے آزاد کے لکچر کی خاص تشہیر کرنے کی صورتیں نکالیں۔ انھوں نے آزاد کے لکچر کی کاپیاں اور مثنوی کی نقلیں دوسرے صوبوں کے تعلیمی محکموں میں بھی بھجوائیں اور تمام اداروں سے درخواست کی گئی کہ اس لکچر کو چھپوا کر مدارس میں تقسیم کیا جائے۔ آزاد کے اس لکچر اور انقلابی باتوں کا اثر فوری طور پر تو زیادہ نہیں ہوا لیکن جیسے جیسے ان کے لکچر کی تشہیر ہوئی تو نئے تجربوں سے ڈرنے والے اہلِ علم اور ادیب اس کی طرف خواہ منفی انداز میں سہی مگر خاصے متوجہ ہوئے۔ اس کے خلاف مضامین چھپنے لگے اور تبصروں کی شکل میں ردِعمل سامنے آنے لگا۔ گارسیں دتاسی جیسے مشہور مستشرق نے بھی اخبار پنجابی کے مئی 1874 ہی کے شمارے میں آزاد کی پوری تقریر کی مخالفت پر مبنی اپنی رائے شائع کرائی۔ اس کے علاوہ اخبار سررشتہ تعلیم میں اس پر تبصرہ شائع ہوا۔ یکم جولائی 1874 کو منشی غلام حسین اور منشی گوبندلال، مدرسین لکھنؤ نارمل

اسکول نے آزاد کے لکچر پر سخت تبصرہ کیا۔ تاہم ان تمام تبصروں اور مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کے نفسِ مضمون پر بحث کرنے کے بجائے زیادہ تر لوگوں نے فروعی مسائل اُٹھانا شروع کر دیے۔ مقامی طور پر لاہور میں اعتراضات کا نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہاں کے اخبارات میں عرصے تک اظہارِ خیال کیا جاتا رہا، اس لیے بھی کہ اب تو مشاعروں کا بھی تواتر شروع ہو گیا تھا اور مشاعروں یا مناظموں کے وسیلے سے بہت سے شاعر اس تحریک کے قریب آنے لگے تھے۔

آزاد کے لکچر کی تائید اور مخالفت میں تحریروں کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ انجمن پنجاب نے اپنے پروگرام کے تحت اپنا پہلا مشاعرہ 20/مئی 1874 کو منعقد کیا۔ جس کا موضوع ہالرائیڈ کے مشورے کے بعد 'برسات' رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ایک سال کے اندر متعدد مشاعرے کچھ اس طرح منعقد کیے گئے:

پہلا مشاعرہ: 20/مئی 1874۔ موضوع 'برسات'۔ شرکا: آزاد، حالی اور بعض دوسرے شعرا

دوسرا مشاعرہ: 30/جون 1874۔ موضوع 'زمستان'۔ شرکا: آزاد، شاہ انور حسین ہما، مولوی اشرف بیگ، منشی الٰہی بخش رفیق، مولوی قادر بخش وغیرہ۔

تیسرا مشاعرہ: 3/اگست 1874۔ موضوع 'امید'۔ شرکا: آزاد، حالی، شاہ عمو جان، مولوی عطاء اللہ عطا وغیرہ۔

چوتھا مشاعرہ: یکم/ستمبر 1874۔ موضوع 'حبِ وطن'۔ شرکا: آزاد، حالی، کرشن لال طالب، مفتی امام بخش، سید اصغر وغیرہ۔

پانچواں مشاعرہ: 19/اکتوبر 1874۔ موضوع 'وطن'۔ شرکا: محمد حسین آزاد، گل محمد عالی، شاہ محمد صادق، علی لکھنوی، مفتی امام بخش، اصغر علی حقیر لکھنوی، مولوی سلطان علاء الدین، عطاء اللہ خاں عطا وغیرہ۔

اس طرح 14/نومبر، 19/دسمبر، 20/جنوری 1875، 13/مارچ 1875 اور 30/جولائی 1875 کو بالترتیب انصاف، مروّت، قناعت، تہذیب اور شرافت انسانی کے موضوعات پر دس مشاعرے منعقد کیے گئے۔

محمد حسین آزاد، کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں ہرطرح کے اطمینان کے باوجود علمی اور ادبی حلقوں میں اپنے ہم خیال لوگوں سے رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ عین اسی زمانے میں سرسید کی علمی اور ادبی کاوشیں بھی نقطۂ عروج پر تھیں اس لیے آزاد نے ان کو تفصیلی خط لکھ کر اپنی تحریر پر ان کا ردِّعمل جاننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس خط کا متن تو اتفاق سے دستیاب نہیں مگر سرسید کا جواب ان کے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' میں شائع ہوا تھا۔ سرسید نے اپنا جواب محمد حسین آزاد کو 19ر اکتوبر 1874 کو لکھا تھا جس میں توجہ طلب باتیں کچھ اس طرح تھیں:

> ''میری نہایت قدیم تمنا اس مجلس مشاعرہ سے برآئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی 'خواب امن' پہنچی۔ بہت دل خوش ہوا۔ درحقیقت شاعری اور زور سخن وری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات اردو زبان میں ادا کیے جائیں۔ یہ کام ہی ایسا مشکل ہے کہ کوئی کر تو دے۔ بعد رمضان انشاء اللہ تعالیٰ ایک مضمون طویل اس باب میں لکھوں گا۔''

اس ضمن میں سرسید نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کیا اور 7ر فروری 1875 کے تہذیب الاخلاق میں ایک طویل مضمون 'علم انشا اور اردو نظم' پر لکھا۔ اس مضمون میں نظم اردو کے مشاعروں کے حوالے سے بہت سی باتیں کی گئی ہیں جن سے بعض کا ذکر یہاں شاید بے محل نہ ہو:

> ''اردو زبان کے علم ادب کی تاریخ میں 1874 کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ ہوا، ہمیشہ یادگار رہے گا ـــــ مولوی محمد حسین آزاد پروفیسر عربی، گورنمنٹ کالج لاہور، نے اس مشاعرے کی بقا اور قیام کے سلسلے میں سب سے زیادہ ہمت صرف کی ہے۔ ان کی طبیعت کے زور اور پاکیزگی مضامین اور شوکت الفاظ اور طرز ادا سے ہم لوگ فائدہ اٹھاتے

ہیں۔ ان کی مثنوی 'خواب امن' جو 'آفتاب پنجاب' میں چھپی ہے ہمارے دلوں کو خواب غفلت سے جگاتی ہے۔ مولوی خواجہ الطاف حسین حالی اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر پنجاب کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے۔ ان کی مثنوی 'حب الوطنی' اور مثنوی 'مناظرہ رحم وانصاف' جو پنجابی اخبار میں چھپی ہے، وہ درحقیقت ہمارے زمانے کے علم وادب میں ایک کارنامہ ہے۔ ان کی سادگی الفاظ، صفائی بیان، عمدگی خیال، ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔ وہ مثنویاں آب زلال سے زیادہ خوش گوار ہیں۔''

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ محمد حسین آزاد کی تحریک پر منعقد کیے جانے والے مشاعروں کی تعداد باقاعدہ طور پر صرف دس تھی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔ اتنی جلدی محض ایک سال کی سرگرمیوں کے بعد ان مشاعروں میں تسلسل قائم نہ رہنے کے مختلف اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ آزاد اور حالی کے درمیان وہ ہم آہنگی باقی نہیں رہ گئی تھی اس لیے حالی نے محض چار مشاعروں میں شرکت کی۔ بعض مورخوں نے بتایا ہے کہ آزاد کے لکچر اور مشاعروں کے ردعمل میں اعتراضات اور طنز وتعریض کا جو سلسلہ شروع ہوگیا تھا اس کے سبب آزاد بددل ہوگئے تھے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس مختصر مدت میں بھی محمد حسین آزاد کے توسط سے انگریزوں کی نئی نظم کی کوششیں تمام اعتراضات کے باوجود ایک تحریک میں تبدیل ہوچکی تھیں اور صحیح معنوں میں محکمۂ تعلیمات کے افسروں کا مقصد پورا ہوچکا تھا۔ ان کا اندازہ تھا کہ بعد کے زمانے میں بھی سرکاری اعانت کے بغیر بھی یہ تحریک آگے بڑھتی رہے گی۔ اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ محکمۂ تعلیمات کا مقصد دراصل راہ دکھانا تھا۔ کرنل ہالرائیڈ بھی اپنی کوششوں سے لیفٹیننٹ گورنر پر یہ ظاہر کردینا چاہتے تھے کہ وہ ان کی مرضی کے مطابق نہایت سرگرمی سے اسی سلسلے کو شروع کراسکتے ہیں۔ اس طرح ان کے خیال میں گورنر کی خوشنودی حاصل ہوچکی تھی۔

یوں بھی مصلحت کا تقاضا ہی تھا کہ مزید منفی ردعمل کو دعوت نہ دی جائے۔ چنانچہ انجمن پنجاب کے لکچرز اور تقریباً دس مشاعروں کا نتیجہ یہ نکلا کہ نظم کے خدوخال میں نمایاں فرق نظر

آنے لگا تھا۔ یہ نظم کی اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں اردو غزل، اعتراضات کا بھی نشانہ بنی اور غزل گوئی کا سلسلہ تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ یہ نظم کی تحریک اور محمد حسین آزاد کی کوششوں کی غیر معمولی کامیابی کا بہترین ثبوت ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشاعروں کی سرگرمی کا سلسلہ منطقی طور پر بروقت موقوف ہوا تھا۔

آزاد کے لیے 1875 اور 1876 اور اس کے بعد کے چند سال علمی اور ادبی اعتبار سے سب سے زیادہ زرخیزی کے سال تھے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اسی زمانے میں آزاد کو انہماک کے ساتھ اپنے علمی اور ادبی منصوبوں کو پایۂ تکمیل پہنچانے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں آب حیات تکمیل کے مراحل سے گزر رہی تھی اور نیرنگ خیال بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ ہوا دراصل یہ کہ جب سے انھوں نے انجمن کے جلسوں کے لیے لکچر دینے اور علمی مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا، اس وقت سے وہ اپنے منتخب مضامین انجمن مفید عام 'قصور' کے رسالے میں اشاعت کے لیے بھی دے دیا کرتے تھے۔ ان دونوں کتابوں کے مضامین کا خاصا بڑا حصہ اسی رسالے میں پہلے شائع ہو چکا تھا۔ انھوں نے اس رسالے میں دو تین مضامین ایسے بھی شائع کرائے جن کا تعلق 'دربار اکبری' سے تھا۔ چنانچہ وہ مضامین ادنیٰ سی تحریف کے بعد 'دربار اکبری' میں شائع ہوئے تھے۔ اس دور کے نمائندہ مضامین میں سے بعض کی تفصیل کچھ یوں ہے: زبانِ اردو سے متعلق کم از کم تین مضامین بعد میں 'آب حیات' کے مقدمے کا حصہ بنے جبکہ زبان اردو سے ہی متعلق ایک مضمون جو نسبتاً تاریخی نوعیت کا نہیں ہے وہ 'نیرنگ خیال' کا دیباچہ بنایا گیا تھا۔ ان کے علاوہ قدیم ہندستان میں اردو کلچر سے متعلق ایک مضمون، یا اطوار ہندوستان سے معنون مضمون بھی انجمن مفید عام کے رسالے میں چھپا تھا۔ ان کے علاوہ احوال خانخاناں، عجیب تذکرۂ سلاطین بطور تاریخ اور شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار، کے عنوانات سے معنون مضامین بھی اسی رسالے میں پہلے شائع ہوئے تھے۔ انجمن کی تقاریر اور مضامین کے زمانے میں کچھ تو سرکاری سرپرستی اور خوشنودی کی بدولت اور کچھ اپنے مزاج کے مطابق علمی اظہار کے مواقع کی فراوانی کے باعث آزاد کی طبیعت علمی کاموں کے لیے کافی حاضر رہا کرتی تھی۔ اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ وہ اپنے باخبر اور واقف کار دوستوں اور ادیبوں کو

خطوط لکھ کر 'آب حیات' لکھنے کے لیے بھی مواد کی فراہمی کرتے رہے۔ محمد حسین آزاد کی نفسیات میں 1857 کی افراتفری اور پورے خاندان کو مشتبہ قرار دیے جانے کے باعث طرح طرح کی گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس لیے جب بعد میں عام معافی کا اعلان ہوا اور اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد لاہور میں کبھی محکمۂ ڈاک کی ملازمت میں، کبھی درسی کتابوں کی تیاری میں، کبھی انجمن کی مصروفیات میں اور کبھی گورنمنٹ کالج کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے انھیں احساس ہوتا کہ اب ان کے ساتھ ایک عالم اور کارآمد انسان جیسا برتاؤ روا رکھا جارہا ہے تو وہ خاصے مطمئن اور ہشاش و بشاش ہو جایا کرتے تھے اور یہ کیفیت ان کو علمی سرگرمیوں کی طرف مائل کردیا کرتی تھی۔ 1876 میں ڈاکٹر لائٹنر جو رخصت پر انگلینڈ گئے ہوئے تھے، واپس آ گئے تو ان کے ساتھ 'سنین اسلام' والی خلش اور شکر رنجی بھی واپس آئی۔ وہ خواہ کتنے بھی ضرورت مند رہے ہوں مگر بے حد خوددار اور خود پسند بھی تھے۔ ایسی سماجی اور نفسیاتی کش مکش سے گزرنے کے باوجود وہ اپنی عزت نفس کا خاصا خیال رکھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر کے سلسلے میں جب الوداعیہ لکھا تھا تو ان کے لیے صفات اور توصیفات کو نقطۂ عروج پر پہنچادیا تھا۔ مگر جب وہ واپس آئے اور آپس میں باہمی تلخی ہونا شروع ہوئی تھی تو وہ ان سے ملاقات کرنے میں بھی پہل کرنے سے احتراز کرنے لگے۔ دنی چند کے نام اپنے ایک خط میں وہ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرا حال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب آئے تو ان سے کالج میں ہی ملا۔ استقبال کو اسٹیشن نہیں گیا۔ دوسرے دن گھر پر بھی جا کر مل آیا۔ اس دن سے پھر گھر پر نہیں گیا اور طریقہ یہی رکھا کہ گھر پر بے بلائے نہ جانا اور زیادہ اختلاط نہ بڑھانا۔ ابھی تک تو وہ بھی سیدھے چلے جاتے ہیں۔ میں بھی چلا جاتا ہوں۔ آگے کا خدا مالک ہے۔''

1877 میں ڈاکٹر لائٹنر سے باقاعدہ اختلافات ہونے کے شواہد ملتے ہیں۔ آزاد کی تنخواہ بڑھانے کی درخواست پر ڈاکٹر لائٹنر کا معاندانہ نوٹ، فارم ہاؤس کی زمین دیے جانے کی مخالفت حتیٰ کہ آزاد کی پروفیسری کے درپے ہوجانا اسی کے شاخسانے تھے۔ محمد حسین آزاد کی

سب سے اہم کتاب 'آبِ حیات' 1880 میں شائع ہوگئی مگر وہ کتاب کو پریس میں دینے سے ایک دو سال قبل ہی دوسری علمی مصروفیتوں میں منہمک ہو گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ بہت پہلے سے ان کے ذہن میں بعض موضوعات پر مبسوط انداز میں لکھنے اور انھیں کتابی صورت میں شائع کرانے کا منصوبہ رہا۔ یہی سبب ہے کہ وہ 1880 سے کم از کم آٹھ دس برس قبل ہی سے اپنی تحریروں اور مضامین کے موضوعات میں یہ بات ضرور پیش نظر رکھا کرتے تھے کہ وہ اپنی کس تحریر کو آئندہ کس کتاب کا حصہ بنائیں گے۔ 1879 سے 1884 کے درمیان قدرے یکسوئی حاصل ہو جانے کے بعد انھوں نے علمی طور پر خود کو زیادہ مصروف کر لیا۔ 'دربارِ اکبری' کی تیاری کے لیے سخت انہماک کی ضرورت بھی تھی۔ وہ تاریخی مواد جمع کرنے اور اس کو مرتب کرنے میں اپنا زیادہ تر وقت صَرف کیا کرتے تھے۔ عین اسی زمانے میں کالج کا نصاب بنانے کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد کر دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی امتحان سے متعلق ذمہ داریاں مستزاد تھیں۔ 1883 کے آس پاس ان کو اطلاع دی گئی کہ 'آبِ حیات' اور 'نیرنگِ خیال' کو امتحان کی غرض سے نصاب میں شامل کر لیا گیا ہے، اس لیے وہ اس کے دوسرے ایڈیشن کے لیے بعض تبدیلیوں اور اضافوں میں مصروف ہو گئے اور 1883 میں ہی 'آبِ حیات' کا دوسرا ایڈیشن چھپ کر آ گیا۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہی وہ 'آبِ حیات' ہے جس کی تقلید آج تک کی اشاعتوں میں کی جاتی ہے۔ گویا کہ پہلا ایڈیشن منسوخ ہی قرار دے دیا گیا تھا۔

محمد حسین آزاد کی تدریسی ملازمت بنیادی طور پر گورنمنٹ کالج لاہور میں تھی، یہ عرصہ تقریباً پندرہ برس کا تھا۔ اس زمانے میں ان کی عربی کی مہارت کا بھی سکہ مان لیا گیا اور دوسری علمی اور ادبی سرگرمیوں میں ان کی فارسی اور اردو سے جس قدر دلچسپی اور ان ادبیات پر جس قدر دسترس کا اندازہ ہوتا تھا، اس کے باعث اہلِ علم میں آزاد کی علمی وقعت نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ گورنمنٹ کالج میں پندرہ سال تک تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد وہ اورینٹل کالج کے اسٹاف میں آ گئے۔ اس لیے کہ اس سال اورینٹل کالج کو گورنمنٹ کالج سے الگ کر دیا گیا۔ اسی وقت سے عربی اور سنسکرت کے اسسٹنٹ پروفیسروں کا تبادلہ پوری طرح گورنمنٹ کالج سے اورینٹل کالج میں کر دیا گیا جس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ گورنمنٹ کالج سے

ان زبانوں کی تدریس کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ گورنمنٹ کالج میں محمد حسین آزاد کی تدریسی خدمات کو بعد کے زمانے میں تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ گورنمنٹ کالج کی تاریخ مرتب کرنے والوں نے آزاد کا ذکر جن الفاظ میں اور جن صفات کے ساتھ کیا ہے وہ شرف بہت کم اساتذہ کو بخشا گیا ہے۔

محمد حسین آزاد یوں تو 1870 کے آس پاس سے پندرہ سولہ برسوں تک بے حد مصروف، علمی طور پر سرگرم اور علمی اور ادبی فتوحات سے مطمئن دکھائی دیتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ 1880 کے بعد ان کو پے در پے مختلف صدمات جھیلنے پڑے تھے۔ ان کے کئی بچوں کا انتقال اسی زمانے میں ہوا۔ ایک جوان اور ہونہار بیٹا اسی دور میں فوت ہوا۔ انھیں جسمانی طور پر متعدد عوارض بالخصوص بواسیر کی حد سے بڑھی ہوئی تکلیفیں اس زمانے میں زیادہ جھیلنا پڑیں۔ مگر جب 1885 کے اوائل میں ان کی عزیز ترین بیٹی اُمۃ السکینہ (جس کی مثال علمی طور پر بھی ان کے دست راست جیسی تھی) کا انتقال ہوگیا۔ اس بیٹی کی وفات کا صدمہ آزاد کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب 'سیر ایران' میں اس بیٹی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''انھیں دنوں تقدیر سے مجھے چند دل شکن صدمے پہنچے جن میں سے سخت صدمہ ایک جوان بیٹی کی موت تھی جو حقیقت میں سات بیٹوں سے گراں بہا تھی۔ وہ میری تصنیفات میں میرا دایاں ہاتھ تھی۔ اس کے مرنے سے میرا دل ٹوٹ گیا اور نفسیات کا قلم دان اُلٹ گیا۔''

یہاں تک کہ اکثر ہوش مندوں کو جنون کا شبہ ہوگیا۔ پٹیالے اور لاہور میں اس کا چرچا بھی ہوا۔ محمد حسین آزاد کی یہ باتیں کچھ غلط بھی نہیں تھیں۔ دراصل گورنمنٹ کالج سے علاحدگی اور اورینٹل کالج میں آنا ان پر بہت شاق گزرا تھا۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج میں کوئی پندرہ برس گزارے تھے۔ وہاں کے ماحول میں رچ بس گئے تھے، طلبا اور اساتذہ ان کے احترام و عقیدت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ تدریس کے معاملے میں ایک تبحر عالم اور انسانی تعلقات اور مراسم کے معاملے میں نہایت بے تکلف اور روادار — اچھے طالب علم ان کے لیے اس حد تک پسندیدہ ہو جایا کرتے کہ وہ انھیں ساتھ ساتھ لیے پھرتے۔ کہیں

ساتھ ٹہلا رہے ہیں، کہیں کسی نہ کسی کھانے پینے کی چیز سے تواضع کر رہے ہیں۔۔۔ کچھ نہیں تو اپنے حسن اخلاق اور شفقت و محبت سے اپنے طلبا کو اپنا گرویدہ بنائے رکھتے تھے۔ اورینٹل کالج میں منتقلی کے زمانے میں بیچ بیچ ان کا ذہن ماؤف رہنے لگا تھا۔ انہی دنوں ان کی عزیز ترین بیٹی اُمۃ السکینہ کا اچانک انتقال ہوا، ڈاکٹر لائٹنر کی ریشہ دوانیاں کسی نہ کسی صورت میں چل ہی رہی تھیں، پھر غضب یہ تھا کہ وہ پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی ہو چکے تھے۔ ان تمام باتوں نے مل کر ان کے ذہنی حالات کو دگرگوں کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُمۃ السکینہ کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک تو ان کی کیفیت یہ رہی کہ غسل خانے میں غسل کے لیے چلے جاتے تو گھنٹوں باہر نہ نکلتے۔ ویسے ہوش و حواس میں ہوتے تو وہ اپنی سطح اور معیار کی باتیں کرتے مگر اچانک کسی بھی وقت جدھر بھی منہ سماتا کھڑے ہوتے اور اس طرف کو نکل جاتے۔

OOO

آزاد کا سفر ایران

یوں تو محمد حسین آزاد برسوں سے ایران کے سفر کا ارادہ کر رہے تھے مگر لاہور کی مصروفیات اور نامکمل علمی منصوبوں کے سبب ابھی تک موقع نہیں نکل پایا تھا۔ وہ پہلے بھی وسط ایشیا کے سفر کے دوران افغانستان اور ایران کا سفر کر چکے تھے، مگر اس وقت معاملہ، بعض مخصوص مقاصد کے تحت ایک اہم مہم کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایران ویسے بھی نسلی اور علمی طور پر ان کے ذہنی سرچشمے کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اطمینان سے ایران کے عالموں، ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کا اشتیاق رکھتے تھے۔ وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کرنا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ فارسی زبان دانی میں مہارت کی غرض سے اہلِ زبان کے ساتھ کچھ دن گزاریں۔ حالانکہ اس زمانے میں ہی جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ذہنی اختلال کی کیفیت کبھی کبھی ضرور طاری ہو جایا کرتی تھی مگر وہ عموماً بالکل ہوش و حواس اور حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ انھوں نے جب اپنی یونیورسٹی سے ایران کے سفر کے لیے اجازت چاہی اور رخصت مانگی تو رجسٹرار کی حیثیت سے ڈاکٹر لائٹز نے ان کی درخواست مسترد کر دی۔ مگر پچھلے چند برسوں میں آزاد بھی لاہور کے حالات، یونیورسٹی کے معاملات اور انگریز حکمرانوں کے جبر و اختیار کی کیفیات سے خوب واقف ہو چکے تھے۔ اس لیے آزاد نے کوئی اور سبیل نکالنے کی ٹھانی۔ اتفاق سے اس وقت

پنجاب کے گورنر سر چارلس ایچیسن تھے جو انجمن پنجاب کے قیام کے زمانے میں لاہور کے ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے۔ انجمن کے جلسوں میں چارلس ایچیسن اکثر و بیشتر شریک ہوا کرتے تھے اور آزاد کی علمی صلاحیتوں سے واقف ہونے کے علاوہ ذاتی طور پر بھی وہ آزاد کو پسند کیا کرتے تھے۔ لائٹنر صاحب سے مایوس ہونے کے بعد محمد حسین آزاد نے ان سے ملاقات کی اور اپنے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافیوں کا ذکر کیا۔ وہ آزاد کی باتوں سے نہ صرف مطمئن اور متاثر ہوئے بلکہ رخصت سے متعلق ان کی درخواست کو بھی منظوری دے دی۔ اس رخصت کی منظوری سے آزاد کو بھی بڑا سکون اور اعتماد حاصل ہوا کہ وہ بعض افسروں کی مرضی کے خلاف بھی اپنی بات منوا سکتے ہیں۔ چھٹی کی درخواست کی منظوری سے آزاد کی دیرینہ مراد برآئی۔ خوشی خوشی ایران کے سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ پہلے لاہور سے کراچی پہنچے، کراچی سے عربیہ نامی جہاز کے ذریعہ بندر عباس اور بحرین سے گزرتے ہوئے بوشہر پہنچ گئے۔ وہاں سے وہ شیراز جا پہنچے۔ وہاں سے اصفہان اور پھر طہران گئے، کاشان اور مشہد پہنچے۔ وہاں بزرگوں کے مزارات کی زیارت کی، فاتحہ پڑھی۔ ہر جگہ تاریخی عمارتوں اور آثار سے متعلق تفصیلی معلوم فراہم کرتے رہے۔ زبان و بیان کا معاملہ ہو یا ایرانی ضرب الامثال اور محاورے کا، ہر چیز پر انھوں نے پوری توجہ مرکوز رکھی۔ علمی اور لسانی طور پر جن لوگوں کے نام انھیں اس سفر میں معلوم ہوتے یا پہلے سے انھوں نے ان کے بارے میں سن رکھا تھا، ان سب کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ملے۔ جہاں بھی ان کو کام کی کتابیں ملتیں کوشش کرتے کہ ان کو خرید لیا جائے۔ اس طرح انھوں نے اپنے سفر ایران کو ہر اعتبار سے کارآمد اور فیض آور بنانے کی کوشش کی۔

محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب 'سیر ایران' میں بڑی تفصیل سے اپنے مشاہدات اور تجربات کا ذکر کیا ہے۔ ویسے تو ان کے مشاہدات اور تجربات خاصے دلچسپ اور معلومات افزا ہیں اور آزاد کے اسلوب تحریر نے ان کے بیان میں اور بھی بہت سے پہلو شامل کر دیے ہیں۔ خود ان کی تحریروں میں جن باتوں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے ان کا اجمالی تذکرہ آزاد کی دلچسپیوں اور ترجیحات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ آزاد نے شیراز میں پندرہ سولہ روز قیام کیا۔ وہاں کے اہم ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتیں کیں۔ ان کو شیراز کی عمارتوں میں فنِ تعمیر کا بالکل

انوکھا انداز نظر آیا۔ عمارتوں کے علاوہ وہاں کے حمام بھی سرد ملک ہونے کے سبب خاص انداز میں پانی گرم رکھنے کے طریقے اور بناوٹ کے اعتبار سے آزاد کو انوکھے لگے۔ وہ شیراز کے بازاروں کی بھی سیر کرتے اور خانقاہوں کا بھی معائنہ کرتے رہے۔ غرضیکہ آزاد کے یہ پندرہ دن بہت کارآمد اور مصروف گزرے۔ شیراز کے بعد وہ اصفہان پہنچے، جہاں سلاطین صفوی کے زمانے میں تعمیر شدہ عمارتیں ان کو بے حد حسین، مستحکم اور پُر جلال معلوم ہوئیں۔ مگر اصفہان میں انھیں محض پانچ چھ دنوں تک قیام کا موقع ملا۔ وہاں سے وہ کاشان چلے گئے اور کاشان سے ہوتے ہوئے ایران کے مقدس شہر 'قم' جا پہنچے۔ 'قم' میں بزرگانِ دین کے مقبروں کی زیارت کرتے رہے اور مزارات پر لگے ہوئے کتبوں کو نقل کیا۔ کتبوں پر نام اور سنِ وفات وغیرہ کے علاوہ دوسری مختلف تحریریں ان کی دلچسپی کا باعث تھیں۔ اشعار اور ضرب الامثال پر ان کی خاص توجہ رہی۔ 'قم' شہر کی سیر ان کے لیے روحانی تسکین کا باعث بنی رہی مگر آخر وہاں بھی کب تک رُکتے، پورے سفر کے پروگرام کو مدنظر رکھتے ہوئے قم کے بعد وہ طہران کے لیے روانہ ہو گئے۔ آزاد کو خاندانی طور پر نادر کتابوں کو جمع کرنے کا شوق وراثت میں ملا تھا۔ مزید یہ کہ طہران میں ان کی دلچسپی کی کتابیں بہت ملیں۔ اب ایک مسافر کے لیے کتابوں کی خریداری کے لیے انتخاب کا بھی مسئلہ تھا۔ اچھی کتابوں کی تلاش و جستجو اور باذوق ادبی شخصیات کی کشش نے ان کی رسائی شاہ ایران کے چچا شہزادہ فرہاد مرزا تک کرادی۔ شہزادہ فرہاد مرزا متعدد کتابوں کے مصنف تو تھے ہی، ان کی علمی و ادبی معلومات بھی گوناگوں تھیں۔ ان کی صحبت میں آزاد کا بڑا جی لگا۔ انھوں نے آزاد کو کئی کتابیں اور بعض نادر تصویریں تحفے کے طور پر دیں۔ ان کے وسیلے سے آزاد کی رسائی وہاں کی نمائندہ شخصیات سے ہوئی۔ طہران میں آزاد کی دلچسپی کی اتنی چیزیں تھیں کہ وہاں وہ تقریباً تین ماہ تک قیام پذیر رہے۔ برف باری شروع ہو چکی تھی اس لیے گرم ملک سے جانے والے محمد حسین آزاد زیادہ سیر و تفریح بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ برف باری کے رُکنے کا انتظار کرتے رہے۔ اس یکسوئی سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے بہت سے فارسی الفاظ کی تحقیق پر توجہ صَرف کی۔ ان کو اندازہ ہوا کہ اگر تلاش کی جائے تو وہاں بہت سی کارآمد اور نادر کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس طرح بہت سی

کتابیں بھی خریدیں۔ طہران سے آزاد نے مشہدمقدس کا رُخ کیا۔ مشہد کے راستے میں وہ سمنان، دامغان، شاہ رود، بسطام، سبزوار اور نیشاپور سے گزرے اور بعض مقامات پر جہاں ضرورت محسوس کرتے مختصر قیام کرکے ان مقامات کی تاریخی اور علمی اہمیت کے مزید قائل ہوئے۔ مشہد میں ان کا قیام دس پندرہ روز تک رہا، جہاں روضہ سے متعلق کتابوں کی فہرست تیار کرڈالی۔ مشہد میں چونکہ بزرگانِ دین، علما، شعرا اور سلاطین کے مزارات بڑی تعداد میں ہیں، آزاد ان کو بھی دیکھتے اور سمجھتے رہے۔ مشہد میں ہی نادرشاہ درّانی کا بھی مزار ہے۔ نادر کی قبراور باقیات کو دیکھنے کے بعد جو تاثر قبول کیا اسے عبرت انگیز انداز میں اپنی کتاب میں ان الفاظ میں قلم بند کیا:

> ''نادر کی قبر دیکھ کر عبرت ہوئی، اللہ اکبر، وہ نادر! جس کی تلوار کی امان نہ تھی اور جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے لشکر پھوس کی طرح اڑتے تھے، وہ ایک ٹوٹے چبوترے پر پڑا ہے۔''

مشہد میں آزاد نے فردوسی، اسدی اور طوسی وغیرہ کے مزارات پر بھی حاضری دی اور فاتحہ پڑھی۔ مشہد کے بعد آزاد نے ہرات اور قندھار کے راستے سے ہندوستان واپسی کا سفر شروع کیا۔ اس درمیان خیرآباد سے آگے روانہ ہوتے ہوئے اونٹ سے گر پڑے اور تقریباً ہلاک ہوتے ہوتے بچے۔ جب وہ 'ہرات' پہنچے تو ان کو اندازہ ہوا کہ افغانیوں کا مزاج اور ان کی افتادِ طبع ایرانیوں سے خاصی مختلف ہے۔ ان کے اندر ایران کے برخلاف مہمان نوازی کی صفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ آزاد چونکہ ہندوستان سے گئے تھے، اس لیے لوگوں کو پہلی نظر میں ہی ایک ہندستانی کی شناخت ہوجایا کرتی تھی۔ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت کے سبب ان کی انگریز دشمنی میں شدت آجا کرتی تھی اور وہ ہر ہندستانی کو انگریزوں ہی کی طرح شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب بھی کسی افغانی سے تعارف ہوتا تو ان کا انداز ہ معاندانہ ہوا کرتا۔ ان سب اسباب نے ان کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔ وہ اکیلے سفر کو جاری رکھنے میں طرح طرح کے خطرات کا اندیشہ محسوس کرتے تھے، اس لیے کسی قافلے کے انتظار میں آزاد کو تقریباً اٹھائیس روز تک افغانستان میں ہی ٹھہرے رہنا پڑا۔ اس وقفے میں انھوں نے آس پاس کے

مزارات پر حاضری دی، امام فخر الدین رازی، ملاّ کاشفی اور مولانا جامی کے مقبروں کی بھی زیارت کی۔ اس عرصے میں آزد کو اطمینان قلب حاصل نہیں تھا، لیکن وہ انتظار میں کب تک رُکے رہتے۔ بالآخر مسافروں کی رفاقت کا تھوڑا سا سہارا پا کر قندھار کا رُخ کیا۔ یہ فاصلہ ان کے لیے دشوار گزار ثابت ہوا۔ پہاڑی راستوں اور دشوار گزار وادیوں کے سبب یہ فاصلہ تقریباً پچیس دنوں میں طے ہوا۔ یہ سفر ان کے لیے خاصا پریشان کن ثابت ہوا۔ کئی بار فاقہ کشی کی نوبت آئی۔ افغانستان میں وہ مشتبہ لوگوں میں ہی شمار کیے گئے۔ لوگ انھیں عموماً اپنے قریب نہ آنے دیتے اور بعض لوگ تو ان کو کافر و مشرک کہہ کر پتھر بھی برساتے۔ اس طرح قندھار تو آ گیا مگر قندھار میں بھی شک و شبہ کی اسی فضا کا سامنا رہا۔ خدا خدا کر کے کسی طرح اندلی پہنچے اور اندلی سے ریل پر سوار ہو کر 24 رجولائی 1886 کو ان کو لاہور پہنچنا نصیب ہوا۔ اس تفصیل کو سامنے رکھیے تو بے ساختہ ہمیں محمد حسین آزاد کا وسط ایشیا کا سفر یاد آتا ہے جو مشکلات سے بھرا ہوا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایران میں جتنے روز آزاد کو قیام اور سیر کا موقع ملا، اتنے دن ان کے نہایت خوش گوار، کارآمد اور معلوماتی ثابت ہوئے۔ جو بھی دشواریاں انھیں پیش آئیں وہ افغانستان کے علاقے میں واپسی کے سفر میں پیش آئیں۔ اتفاق سے پہلے بھی افغانستان کے سفر میں انھیں اسی طرح کے ناخوش گوار تجربات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

ایران سے واپس آ کر محمد حسین آزاد نے اپنے سفر ایران کی تفصیلات اور علمی اکتسابات کے بارے میں انجمن ہال لاہور میں ایک لکچر دیا۔ اس لکچر کی اطلاع عوام کو پہلے ہی دے دی گئی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر طرح کے لوگوں نے اس لکچر میں بڑی تعداد میں شرکت کی۔ لوگوں کا اشتیاق دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ آزاد کے لکچر بھی بے حد معلوماتی اور دلچسپ ہوا کرتے تھے۔ ایران کی روداد میں لوگوں کی اتنی دلچسپی تھی کہ آزاد کا پورا لکچر نہایت اشتیاق سے سنا گیا۔ انھوں نے ایران کے سفر کا جو روزنامچہ لکھا تھا اس کو آزاد نے خود تو کتابی شکل میں شائع نہیں کرایا تھا البتہ اسے ترتیب دے کر آغا محمد طاہر نے 'سیر ایران' کی صورت میں بعد میں شائع کرایا۔ گویا یہ کتاب بھی آزاد کی تصنیفات کا حصہ تھی۔ ایران سے متعلق مشاہدات اور اطلاعات کو آزاد نے اپنی زیادہ تر کتابوں میں جگہ جگہ استعمال کیا ہے۔ ویسے ایرانی صنعت گری کا نقش آزاد کے

ذہن پر بہت گہرا مرتسم ہوا۔ اس کا ایک نمونہ اس تحریر میں ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے اپنے ایک شاگرد کو لکھ کر بھیجا تھا:

> ''یہاں کے عجائب کا کیا شمار ہو سکتا ہے۔ ادنیٰ ادنیٰ شے آنکھوں میں رکھ لینے کے قابل ہے...... جاڑے کے کپڑے ایسے ہیں کہ برسوں تک رفاقت کریں۔ چائے دان، چھوٹے چھوٹے ساوار بہت خوش نما جن پر چار پیالیاں چائے کی آ جائیں۔ سامنے میز پر دھرلو، آپ ہی بناتے جاؤ پیتے جاؤ۔ چاقو اور قینچیاں عمدہ اور براں قابل تعریف اور دیرپا۔ 5-6 آنے سے لے کر روپیہ ڈیڑھ روپیہ تک، جو شمشیر ایران میں خوبیاں تھیں وہ ساری اب ان میں موجود ہیں۔''

محمد حسین آزاد لاہور سے ایران رخصت اتفاقیہ پر گیے تھے۔ یہ سرکاری نوعیت کا کام نہ تھا۔ وہ عرصے سے اطمینان کے ساتھ ایران کے سفر کا ارادہ رکھتے تھے۔ علمی اعتبار سے بھی اور نسلی تعلق کی بنا پر بھی۔ مگر آزادی کے ساتھ ہنوز ان کو موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس بار ڈاکٹر لائٹز کے درخواست کو مسترد کرنے کے بعد سر چارلس اچیسن کے رحم و کرم سے جو موقع ملا اس میں نصف تنخواہ پر رخصت دیے جانے کی وضاحت تھی۔ اس کے سبب آزاد کو یک گونہ سکون حاصل ہوا، لیکن ذہن تو اس سے قبل سے ہی الجھا ہوا تھا۔ اُمۃ السکینہ کے انتقال نے ان کا اعتماد خاصا متزلزل کر دیا تھا۔ اسی باعث وقتاً فوقتاً ان پر کچھ دورے سے پڑنے لگے۔ بعض لوگوں نے انہی دوروں کو ہی جنون کا نام دینا شروع کر دیا تھا۔ گرچہ اس بات میں زیادہ حقیقت نہیں تھی۔ ان کی نفسیاتی الجھنیں گوناگوں تھیں اور ادھر پے در پے ان پر ایسی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی جس کو جنون کے آغاز کا نام دینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں تھا۔ تاہم اس وقت با قاعدہ جنون کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ ایسا ہوتا تو وہ اپنے کالج کے کام سے چھٹی لینے کی غرض سے اس قدر دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے تھے۔ لائٹز جیسے انسان سے رابطہ کیے رہنا، ان کی بد مزاجی برداشت کرنا اور اس میں زک اُٹھانا اور پھر چارلس اچیسن سے رجوع کرنا، اس معاملہ کو تمام باریکیوں کے ساتھ سلجھانا اور ان کو پوری طرح مطمئن کر دینا کوئی

معمولی بات نہ تھی۔ یہ تمام کارگزاریاں اس بات کی شہادت کے لیے بہت کافی ہیں کہ آزاد 1885 کے آس پاس جنون میں مبتلا نہیں بلکہ متاثر ہوئے تھے۔ بلکہ اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ لگاتار ذہنی اذیتیں، انگریز حکام کے معاندانہ رویے، ملازمت کے سلسلے میں پے در پے دشواریاں اور اپنے ذہنی اور علمی منصوبوں کو پوری طرح پایۂ تکمیل پر نہیں پہنچا پانا، ان کے لیے لگاتار سوہان روح بنا رہا۔ تاہم ان تمام معاملات کے باوجود وہ تمام باتوں سے نبردآزما رہے۔ اورینٹل کالج اور اس سے قبل پندرہ سال تک گورنمنٹ کالج میں ایک مثالی استاد کی حیثیت سے اپنا رعب و دبدبہ قائم کیے رہنا، انجمن کے جلسوں میں محض فعال ہی نہیں عام اہلِ علم کے سرخیل بنے رہنا، نظم جدید کے آغاز کو ایک تحریک میں تبدیل کردینا اور آخری زمانے میں ایران کے سفر کے دوران، خواہ کتابوں کی حصول یابی ہو، خواہ سیر و تفریح، خواہ اہلِ علم سے ملاقاتیں ہوں یا خواہ تاریخی عمارتوں اور فنِ تعمیر کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرکے بہت سے نتائج نکال لینے جیسی باتیں کوئی معمولی نہ تھیں۔ اس لیے جس حکمت عملی یا باریک بینی، تجزیاتی صلاحیت اور مصلحتوں اور سیاسی صورت حال کی رعایت کرتے ہوئے تمام ناmساعد حالات سے نہایت کامیابی و کامرانی پہ گزر جانا کسی اور آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔

ایک تو یہ تمام باتیں تھیں مگر محمد حسین آزاد پر اتنے لمبے عرصے کے بعد صورت حال نے اضمحلال کی کیفیت پیدا کرنی شروع کردی تھی۔ ڈاکٹر لائنز، آزاد کے ایران سے واپس آتے وقت لاہور سے رختِ سفر باندھ چکے تھے۔ کالج میں کوئی بظاہر ان کی کاٹ کرنے والا نظر نہیں آتا تھا مگر آزاد کا اضمحلال روز بروز بڑھتا ہی جارہا تھا۔ اورینٹل کالج سے جو ان کا دلی اور جذباتی رشتہ قائم ہوچکا تھا، وہ کسی بھی طرح بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ وہ اورینٹل کالج پہنچ کر دل برداشتہ رہتے تھے اور ہوسکتا ہے کہ اس دل برداشتگی نے ہی ان کو جلد سے جلد ایران کے سفر کی طرف متوجہ کیا ہوگا۔ ایران سے وہ اَن گنت نادر اور اہم کتابیں اپنے ساتھ لائے۔ اس لیے سب سے زیادہ فکر ان کو ایک اعلیٰ درجے کی لائبریری بھی قائم کرنے کی تھی۔ بڑی کوشش کے بعد میونسپل کمیٹی نے ان کی درخواست پر توجہ دی اور انھیں لائبریری کے لیے کچھ زمین مل گئی۔ آزاد نے اب تک کا خاصا اندوختہ صرف کرکے اس زمین پر ایک عمدہ لائبریری تیار

کرادی۔ اس لائبریری میں اَن گنت کم یاب کتابیں جمع ہوگئیں ـــــ وہ قلمی مخطوطے بھی جو آزاد ساری زندگی جمع کرتے رہے تھے، انھوں نے لائبریری ہی میں احتیاط کے ساتھ محفوظ کرادیے۔ لائبریری کی تعمیر اور اس سلسلے میں دوسری جدوجہد میں آزاد کی صحت خاصی متاثر ہوئی۔ 1890 میں یہ لائبریری بندی ہونے لگی تھی مگر گراں بہا کتب خانے کو کوئی بھی ضائع کردینا نہیں چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں بھی پہل میونسپل کمیٹی کے لوگوں کی طرف ہی سے ہوئی۔ انھوں نے اس کی تعمیر اور دوسرے مصارف کا حساب کرکے پوری لائبریری اپنے قبضے میں لے کر، عوام کے استعمال کے لیے وقف کردی۔ ہاں اہم کتابیں چونکہ ہنوز محمد حسین آزاد کے وارثین کی تھی اس لیے بعد کے زمانے میں آزاد کے وارث آغا محمد ابراہیم نے یہ تمام کتابیں پنجاب یونیورسٹی کو عطیہ کے طور پر دے دیں جہاں انھیں 'آزاد کلکشن' کے نام سے ہنوز بڑے اہتمام سے محفوظ رکھا گیا ہے۔ جب 1887 میں ملکہ وکٹوریہ کی تاج پوشی کا پچاس سالہ جشن منایا جارہا تھا اس موقع پر ہندستان میں بھی مختلف محکمہ وحرفت کے ماہرین کو اعزازات سے نوازا گیا تھا۔ اس وقت تک تاج برطانیہ کی طرف سے کسی ہندستانی اہلِ علم کو شمس العلما کا خطاب دینا شروع نہیں کیا گیا تھا۔ محمد حسین آزاد وہ پہلے خوش نصیب تھے جن کی علمی، ادبی اور دانشورانہ خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں شمس العلما کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے کئی سال کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا بعد میں منشی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، خواجہ الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی جیسے ممتاز علما کو بھی اس اعزاز اور خطاب کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس پورے عرصے میں لگاتار صدمات جھیلتے رہنے، بچوں کے پے درپے انتقال، انگریز حکام کی سخت گیری جیسے تمام موانعات کے باوجود آزاد اپنے علمی کام سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ ایران کے سفر کے علمی اندوختہ کے طور پر جو لسانی اور ادبی معلومات کا ذخیرہ ان کے ہاتھ آیا تھا ان کو نہایت سلیقے سے اپنی کتاب 'سخن دانِ فارس' کے پہلے سے نامکمل پڑے مسودے میں سمودیا۔ اس کے بعد وہ دربارِ اکبری کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ دیوانِ ذوق کی ترتیب و تدوین جو عرصے سے التوا میں پڑا ہوا تھا، اب اس کی طرف خاص توجہ ہوئی۔ یہ بات ایک سے زیادہ بار زیرِ بحث آچکی ہے کہ محمد حسین آزاد نے اپنے عنفوانِ شباب کے ہی زمانے سے

استاذ ذوق کے ایک ایک شعر کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ ان اشعار سے وہ کبھی غافل نہیں ہوئے تھے۔ ان پر نظر ثانی کرتے رہتے، کسی بھی شعر کا صحیح ترین متن مرجح محسوس ہوتا تو اس کو بلا تاخیر شامل کر لیتے تھے۔ دیوانِ ذوق کی تدوین اور اس کے طویل مقدمے کی تسوید میں انھوں نے اپنی دانست میں اپنی ساری صلاحیتیں صَرف کر دیں۔ بعض لوگوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ اپنی عزیز ترین بیٹی اُمۃ السکینہ کے انتقال کے بعد ان کے جنون کا آغاز ہوا تھا اور از خود رفتگی کی بعض علامات نمایاں ہونا شروع ہوئی تھیں مگر دیوانِ ذوق کی تیاری کے زمانے میں ان کا ذہن بڑی حد تک قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ ویسے تو اس عالم میں بھی وہ ہر وقت جنونی یا غائب دماغ کا تاثر نہ دیتے مگر یہ کیفیت بہت نمایاں ہو گئی تھی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ دیوانِ ذوق کی ترتیب و تدوین کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا، ورنہ قدرے بعد میں جب جنونی کیفیت بار بار طاری ہونے لگی تھی، اس صورت میں اس کام کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کا شاید امکان بھی نہ ہوتا۔ اب 1890 کا سن آ چکا تھا، آزاد کی ضعیفی اور از خود رفتگی قابو سے باہر ہونے لگی تھی۔ اس لیے ان کے لیے اپنی تدریسی خدمات کو جاری رکھنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے اس صورت حال کو دیکھ کر ان کے احباب اور خیر خواہوں نے ان کی سبک دوشی کی سبیل نکالنے کی کوشش شروع کی۔ بالآخر 2/جون 1890 کے بعد ان کی پنشن کا تعین پچاس روپے ماہانہ کے بہ قدر مقرر ہو گیا۔

OOO

محمد حسین آزاد، عالمِ جنون میں

محمد حسین آزاد کی زندگی کے آخری پندرہ بیس برس عالم جنون میں گزرے۔ اس پاگل پن کے آغاز میں بے خوابی اور اضمحلال اور انجانے خوف میں مبتلا رہا کرتے اور امتدادِ وقت کے ساتھ ان پر باقاعدہ جنون کے دورے پڑنے لگے تھے۔ عین اس زمانے میں بھی جب وہ جنونی باتیں کیا کرتے تھے، اس وقت بھی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ ہوش وحواس کی باتیں کرنا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی کسی کو اچھی طرح پہچاننے لگتے اور پھر تھوڑے ہی وقفے سے وہی شخص ان کے لیے بالکل اجنبی بن جایا کرتا۔ کبھی کبھی رات رات بھر ٹہلا کرتے اور لگاتار اشعار پڑھا کرتے تھے۔ خودکلامی کے انداز میں پرانے شاعروں اور مرحوم بزرگوں سے باتیں کرنے لگتے تھے۔ ان کے اعزہ اور احباب ان کو دوا دیتے تو وہ ان کو پھینک دیا کرتے تھے۔ جنون کی کیفیت میں لاہور سے کبھی پٹیالہ کے سفر پر نکل پڑتے اور کبھی کسی اور شہر کے سفر پر۔ دہلی پہنچ جانے اور علی گڑھ اچانک وارد ہو کر سرسید احمد خاں سے ملاقات کرنے کے حوالے تو زیادہ تر مورخین نے دیے ہیں۔ دربار اکبری کی اشاعت میں جو تاخیر ہوئی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اسے اپنی بڑی وقیع کتاب اور ایک جلیل القدر بادشاہ کی زندگی کی روداد کہا کرتے تھے اور کسی اور کے حوالہ کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ انھیں روحانیات سے پہلے کبھی

دلچسپی رہ چکی تھی۔ خواجہ ناصر نذیر فراق، خواجہ میر درد کے نواسے تھے، ان کو آزاد سے شرف تلمذ رہ چکا تھا۔ وہ ایک بار اپنے استاذ سے ملنے اور ان کی خیریت معلوم کرنے دہلی سے لاہور گئے تو وہاں محمد حسین آزاد کے گھر میں آزاد تو نہ ملے ان کے پوتے آغا محمد یوسف باہر آئے۔ انھوں نے فراق کی ملاقات محمد حسین آزاد سے امام باڑے لے جاکر کرائی۔ وہ اکثر گھر سے نکل کر امام باڑے میں چلے جایا کرتے تھے۔ وہاں جاکر فراق نے یہ دیکھا کہ بوریے پر ایک نڈھال بوڑھا کھانا کھا رہا ہے۔ ان کے کپڑے گندے تھے اور سامنے مٹی کی رکابی رکھی تھی جس میں شوربہ ہے اور وہ بہ مشکل روٹی توڑ توڑ کر شوربے میں ڈبوتے ہیں اور کسی طرح نگل جاتے ہیں۔ جب فراق نے سلام کے بعد اپنا نام بتایا اور توقع کی کہ وہ انھیں ضرور پہچان لیں گے تو آزاد نے پہچاننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد بولے کہ تم اگر میرے شاگرد رہ چکے ہو تو دوڑ کر میرے لیے گرم گرم جلیبیاں لے آؤ۔ مگر جب جلیبیاں آئیں تو ٹھنڈی تھیں اس لیے آزاد سے کھائی نہ گئیں۔ اسی موقع پر آغا محمد یوسف نے ناصر نذیر فراق کو بتایا کہ اب تو یہ حالت ہے کہ وہ (آزاد) ''روٹی دسترخوان میں لے جاؤ تو دسترخوان جلا دیتے ہیں۔ سالن چینی کی رکابی میں جائے تو رکابی توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ تانبے کی رکابی میں کھانا دیا جائے تو بازار لے جاکر رکابی بیچ آتے ہیں۔ انھیں صاف ستھرے کپڑوں سے بیر ہے۔ ادھر پہنائے گئے اور اُدھر انھوں نے پھاڑے۔'' یہ بات چیت فراق اور خواجہ یوسف کی ہو ہی رہی تھیں کہ آزاد ٹہلتے ہوئے ادھر آ نکلے۔ ہوش وحواس اس وقت ٹھکانے تھے، بغیر بتائے ہوئے ناصر نذیر فراق کو پہچان لیا اور نام لے کر ان کی خیریت پوچھنے لگے۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد فراق نے آزاد کو ایک تازہ سلام سنایا۔ اس پر وہ خوش ہوئے زیادہ تر شعروں کی تعریف کی اور پھر اچانک اٹھ کر اجنبیوں کی طرح بازار کی طرف چل دیے۔

محمد حسین نے اپنے جنون کے زمانے میں جو دہلی کا سفر کیا تھا تو وہاں ان کی ملاقات ڈپٹی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ سے کئی بار ہوئی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب دہلی سے لاہور آزاد واپس لے جائے گئے تو وہ کسی طرح لاہور میں رُکنے کو تیار نہ تھے۔ بار بار دہلی اور پنجاب کے دوسرے علاقوں کی طرف جانے کی کوشش کرتے مگر اب ان کے گھر والے

بالخصوص بیٹے آغا محمد ابراہیم ان کو لاہور واپس لے آتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک بار سرسید احمد خاں سے ملاقات کی غرض سے علی گڑھ پہنچ گئے۔ سرسید احمد خاں نے جب ان کی یہ حالت دیکھی کہ پیر لمبے پیدل سفر سے سوجے ہوئے ہیں اور کپڑے گرد آلود ہیں تو وہ آزاد کو اپنے گھر کے اندر لے گئے، نہلا دھلا کر کپڑے تبدیل کرائے اور کئی روز تک اپنا مہمان رکھا۔ آزاد ہوش و حواس میں تو تھے نہیں مگر کسی کسی وقت بالکل اپنے آپے میں ہوتے اور سرسید احمد خاں سے طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ چند روز بعد سرسید نے اپنے کسی آدمی کے ساتھ انھیں لاہور پہنچوایا۔ سرسید احمد خاں سے ہی متعلق ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک واقعہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے ایک تازہ مضمون ''محمد حسین آزاد، خواندہ، سعیدہ، فہمیدہ'' میں ڈپٹی نذیر احمد کے لکچر کا ذکر کرتے ہوئے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے جو آزاد کے عالم جنون میں بھی ان کے ادبی مذاق اور علم و فضل کی عمدہ شہادت پیش کرتا ہے:

> ''لاہور میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا، نذیر احمد بھی شریک ہوئے۔ آزاد کو خبر ہوئی تو وارفتگی کے باوجود ان سے ملنے پہنچے۔ باتیں ہوتی رہیں، کبھی الجھی ہوئی کبھی سلجھی ہوئی۔ اس دوران نذیر احمد نے کہا: سرسید کی فرمائش ہے، ایک لکچر میرا بھی ہوگا۔ اگر آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں تو مجھے اطمینان ہو جائے۔ آزاد نے پوچھا، کیا ہے وہ لکچر؟ نذیر احمد نے لکچر ان کے سامنے رکھ دیا۔ آزاد نے وہیں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ کوئی گھنٹہ بھر میں پورا لکچر دیکھ ڈالا۔ جگہ جگہ کاٹ چھانٹ کرتے گئے۔ کوئی صفحہ اصلاح سے نہیں بچا۔ پھر بولے بھئی نذیر! تم اردو لکھنا بھول گئے ہو، آزاد کی اصلاح دیکھ کر نذیر احمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگے: اس ملک میں اب بھی ایک آدمی ایسا موجود ہے جو مجھ بوڑھے کو اصلاح دے سکتا ہے۔ یہ آزاد کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔''

OOO

تصنیفات وتالیفات

محمد حسین آزاد کی کتابوں کی تعداد ویسے تو خاصی بڑی ہے مگر ان کی تصنیفات کو اگر مختلف خانوں میں تقسیم کر کے دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی کتابیں دراصل بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی غرض سے لکھی گئی ہیں جن کو درسی کتابوں کا نام دینا زیادہ مناسب ہے۔ اتفاق سے آزاد نے درسی نوعیت کی جتنی کتابیں لکھیں یا تیار کیں ان کا تعلق ان کی ملازمت اور فرائض منصبی سے تھا۔ یعنی پنجاب کے محکمۂ تعلیمات سے وابستہ ہونے کے باعث ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ یا تو انفرادی طور پر بعض درسی کتابیں تیار کریں یا پھر اس قسم کی کتابوں کی تیاری میں کسی نہ کسی طور پر شریک ضرور رہیں۔ تاہم آزاد کو نوعمر لوگوں کی ذہنی تربیت سے ایک خاص لگاؤ بھی تھا اس لیے انھوں نے قواعد، اصولِ لسانیات، صحت اور عام سماجی مسائل سے متعلق بھی بہت سے کتابچے تیار کیے تھے۔ محمد حسین آزاد کی ان درسی اور ابتدائی نوعیت کی کتابوں کے علاوہ تقریباً ایک درجن وہ معیاری اور بلند پایہ کتابیں ہیں جن کو صحیح معنوں میں آزاد کی علمی، ادبی اور دانشورانہ شخصیت کا شناخت نامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ آزاد کی بعض ایسی کتابیں بھی ہیں جن سے ان کے ذہنی اور نفسیاتی رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر فلسفہ، علم کلام، روحانیات، تاریخ اور عربی و فارسی زبانوں سے متعلق

ان کی متعدد ایسی کتابیں ہیں جو ان کی دلچسپی اور رجحانات کے تنوع کو ظاہر کرتی ہیں۔ جہاں تک ان کی ابتدائی درسی کتابوں کا سوال ہے تو وہ محض نام کے لیے درسی کتابیں ہیں، حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے ان کی تیاری میں خاصی ریاضت سے کام لیا تھا اور بچوں کی نفسیات اور زبان دانی کا ہر مرحلے پر خیال رکھا تھا۔ انھوں نے اپنی درسی کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں جن مراحل کو پار کیا اور جس تجربے سے گزرے ان کا ذکر ایک جگہ کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''بڑا حصہ عمر گراں کا سررشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صَرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انھوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ پھر انھیں بار بار کاٹنا اور بنانا، لکھنا اور مٹانا۔ بڈھا ہوکر بچہ بننا پڑا۔ پھرتے چلتے، جاگتے سوتے، بچوں ہی کے خیالات میں رہا۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صَرف ہوئے، تب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے۔''

آزاد کی ابتدائی درسی کتابوں کا امتیاز یہ تھا کہ وہ شروع سے ہی بے حد مقبول رہیں۔ کچھ اتنی مقبول کہ وہ پورے پنجاب اور ملک کے دوسرے حصوں میں ابتدائی اور ثانوی سطح کی کلاسوں کے لیے عرصۂ دراز تک نصاب کا حصہ رہیں۔ آزاد کی پہلی کتاب 'نصیحت کا کرن پھول' تھی اور اس کے بعد متعدد درسی کتابیں جو اردو کی پہلی، دوسری اور تیسری کتابوں کے نام سے موسوم تھیں — ان کو اس زمانے کے زیادہ نوجوانوں نے اپنے لڑکپن میں ضرور پڑھا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ آزاد کا سلیس اور سادہ اسلوب اور ان کے مخصوص لب ولہجہ کی چھاپ ان کی ہر کتاب پر موجود ہے۔ اسی زمانے کی ایک اہم کتاب 'قصص ہند' (جلد 2) بھی ہے جس میں ہندوستان کے دور قدیم اور دور وسطیٰ کے بہت سے اہم، عبرت آمیز اور تاریخی واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی چونکہ نوعمر طلبا کے لیے لکھی گئی تھی اس لیے اس میں فارسی تراکیب اور مشکل الفاظ کا استعمال تو نہیں ملتا مگر منظر نگاری، جزئیات نگاری، تخیل کی کارفرمائی اور زبان وبیان کے جادو کو ضرور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ آزاد نے فارسی اور عربی قواعد سے متعلق بھی جو

کتابیں لکھی تھیں ان کا تعلق بھی ابتدائی تعلیم و تربیت سے تھا۔ مثال کے طور پر جامع القواعد، قواعد پارسی، اردو قواعد، عربی قواعد، حکایاتِ آزاد، آموزگار فارسی وغیرہ کو اسی خانے میں رکھا جاسکتا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ آزاد نے بچوں کے لیے متعدد نظمیں بھی لکھ کر اپنی کتابوں میں شامل کیں۔ اس قسم کی نظموں میں دانستہ طور پر ادبی محاسن پر توجہ صَرف کرنے سے زیادہ بچوں کی نفسیات اور نوعمر طلبا میں اخلاقی، سماجی اور تہذیبی اصلاح کی تحریک پیدا کرنے کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

محمد حسین آزاد نے محکمۂ تعلیم سے وابستگی کے زمانے میں اپنی منصبی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے بچوں کے لیے جو درسی کتابیں لکھیں ان کا اندازہ گزشتہ صفحات میں درسی کتابوں سے متعلق فراہم کردہ تفصیلات سے ہو جاتا ہے۔ مگر ان کتابوں کو ان کی تمام تر افادیت کے باوجود امتدادِ وقت کے ساتھ تقریباً بھلا دیا گیا ہے۔ تاہم ان کی تیاری میں آزاد نے جس محنت شاقہ کا مظاہرہ کیا اور بچوں کی نفسیات کا خیال رکھتے ہوئے اپنے سادہ اور سلیس اسلوب میں جس صلاحیت اور انفرادیت کے نقوش مرتسم کیے ہیں اس کو اردو کی درسی کتابوں کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان تمام درسی کتابوں کے علاوہ محمد حسین آزاد کی شناخت اصل میں ان کی جن تصنیفات سے کی جاتی ہے ان کو نشان زد کرنا اور ان میں سے نمائندہ کتب کی نوعیت سے واقف ہونا ناگزیر ہے۔ اس مقصد کے حصول کے طور پر یہاں محمد حسین آزاد کی تقریباً تمام دستیاب اور بعض نایاب و کم یاب کتابوں کی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

(1) آبِ حیات
(2) نیرنگِ خیال
(3) سخن دانِ فارس
(4) دربارِ اکبری
(5) دیوانِ ذوق (ترتیب و تدوین مع طویل مقدمہ)
(6) نگارستان فارس
(7) نظم آزاد

(8) سیر ایران (مرتبہ آغا طاہر)

(9) لغت آزاد

(10) قند پارسی

(11) اکبر (ڈرامہ)

(12) مکتوبات آزاد (مرتبہ جالب دہلوی)

(13) وسط ایشیا کی سیر (مرتبہ آغا محمد اشرف)

(14) خم کدۂ آزاد

(15) سنین اسلام (بہ اشتراک ڈاکٹر لائٹز)

(16) آموز گار پارسی

(17) جامع القواعد

(18) جانورستان

(19) فلسفۂ الٰہیات

(20) سپاس ونماک

(21) نصیحت کا کرن پھول

(22) قصص ہند (حصہ دوم)

(23) بیاض آزاد

(24) جغرافیہ پنجاب

(25) آئینۂ صحت

(26) مکاشفات آزاد

(27) عربک انٹرنس کورس (ترجمہ)

(28) شہزادہ ابراہیم کی کہانی

(29) کائنات عرب

(30) تذکرۂ علما

(31) اردو کی پہلی کتاب (سلسلۂ نو)
(32) اردو کی دوسری کتاب (سلسلۂ نو)
(33) اردو کی پہلی کتاب (سلسلۂ قدیم)
(34) اردو کی دوسری کتاب (سلسلۂ قدیم)
(35) اردو کی تیسری کتاب
(36) اردو کی چوتھی کتاب
(37) فارسی کی پہلی کتاب
(38) فارسی کی دوسری کتاب
(39) قواعد اردو
(40) قواعد فارسی

مندرجہ بالا تصنیفات و تالیفات کے علاوہ محمد حسین آزاد کی متعدد کتابوں کے مسودے بھی عرصۂ دراز تک ان کے اعزہ اور لواحقین کے پاس محفوظ رہے ہیں جن کی اشاعت کی نوبت تک نہیں آئی۔ ان میں سے چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

(1) تاریخی مقامات
(2) ترکی قواعد
(3) عربی قواعد
(4) شگفت
(5) اردو قواعد

○○○

زندگی کے آخر ایام اور وفات

محمد حسین آزاد نے اپنی زندگی کے کم و بیش آخری بیس سال جنون کے عالم میں بسر کیے۔ شروع میں تو وحشت کی کیفیت رہا کرتی تھی، نیند آنا بند ہوگئی تھی اور ہر چیز سے خوف آنے لگا تھا۔ ان سب کیفیات نے آخری برسوں میں پوری طرح پاگل پن کی صورت اختیار کر لی۔ جنون کے ابتدائی برسوں میں ان کو دیکھنے والا کوئی شخص آسانی سے یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ ان پر پاگل پن کی کیفیت بھی طاری ہوتی ہے۔ اکثر ہوش وحواس میں ہوتے۔ اپنے علمی کاموں سے کبھی غافل نہیں رہے۔ عام لوگوں سے بالکل صحیح الدماغ آدمی جیسا برتاؤ کرتے، مگر ان کے گھر والے جو ہر وقت ان کے معمولات سے واقف رہا کرتے تھے، ان کو پوری طرح اندازہ ہو جاتا تھا کہ کس وقت ان کی کیفیت بدل رہی ہے؟ اور اس کیفیت میں ان کو چھیڑنا یا ان کے کام میں دخل دینا خطرے سے خالی نہیں۔ ان کا ردِعمل ایسے موقعوں پر بالکل غیر متوقع سا ہو جایا کرتا تھا۔ امتدادِ وقت کے ساتھ جب ہوش وخرد کا اثر کم اور جنون کی کیفیت کا وقفہ بڑھنے لگا تب بھی وہ بظاہر مسکرا مسکرا کر بات کرنے کی کوشش کیا کرتے۔ پھر آہستہ آہستہ سارے لاہور میں یہ خبر عام ہونے لگی کہ آزاد پاگل ہو گئے ہیں۔ پاگل پن کی کیفیت میں بھی ان کی ادائیں دیکھنے کے قابل ہوا کرتی تھیں۔ کبھی خود کلامی کے انداز میں

میر تقی سے باتیں کر رہے ہیں، کبھی اپنی مرحومہ بیوی کو یاد کر کر کے خوش ہو رہے اور کبھی اکابر شعرا کا نام لے کر ان کو اپنے آپ جھک جھک کر سلام کر رہے ہیں۔ اس کام میں وہ رات کے بڑے حصے میں صرف ٹہلتے رہا کرتے اور مختلف شعرا کے اشعار پڑھتے رہتے تھے۔ اپنے استاذ شیخ محمد ابراہیم ذوق کی یادیں غالب رہا کرتیں۔ ان کے اشعار اور ان کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کو اس طرح یاد کرتے گویا اپنے مخاطب کو استاذ کے واقعات سنا رہے ہیں۔ علاج کے لیے کوئی دوا دی جاتی تو اس کو پھینک دیا کرتے، کپڑے پھاڑ لیا کرتے اور کھانے کے بعد ٹوٹنے والی پلیٹ کو توڑ دیا کرتے یا کم سے کم سامنے کے کسی بھی برتن کو پھینک ضرور دیا کرتے تھے۔ وہ جنون میں لاہور سے پیدل چلتے چلتے دہلی جا پہنچتے اور منشی ذکاء اللہ سے جا کر ملے۔ انھوں نے بڑی آؤ بھگت کی اور ان کی کیفیت کی اطلاع ہونے کے باعث کچھ اور خصوصی توجہ سے ان کو اپنے پاس ٹھہرائے رکھا۔ ان کے پاس علمی و ادبی گفتگو، بحث و مباحثہ اور شعر و شاعری میں مصروف ہو جایا کرتے۔ انہی دنوں مولوی نذیر احمد نے بھی اسی کیفیت میں ان سے متعدد بار ملاقات کی۔ ایک بار پیدل چلتے ہوئے علی گڑھ پہنچ گئے۔ مقصد اس وقت بھی یہی تھا کہ سر سید احمد خاں سے ملاقات کریں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ سر سید نے ان کو بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ اپنے ساتھ ٹھہرائے رکھا اور اپنے کسی ملازم کے ہمراہ ان کو لاہور تک پہنچوایا۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے کہ دربار اکبری کا مسودہ تیار صورت میں ان کے پاس موجود تھا۔ وہ اپنی جنونی کیفیت کی وجہ سے مسودے کو کسی شخص کو اشاعت کے لیے دینے کو کسی طرح تیار نہ ہوتے اور یہی کہتے کہ اتنے عظیم الشان بادشاہ سے متعلق اس کتاب کو میں کسی ہما شما کے حوالے نہیں کر سکتا۔ کافی دنوں کے بعد ان کو بہلا پھسلا کر مسودہ حاصل کیا جا سکا اور پھر اسے اشاعت کے لیے ان کے بیٹے نے کسی پریس کے حوالے کر دیا۔

آزاد کو پہلے بھی روحانیات اور مخفی علوم سے دلچسپی رہ چکی تھی۔ عالم جنون میں یہ دلچسپی اور بھی دو چند ہو گئی۔ وظیفے اور چلّے میں مصروف ہو جایا کرتے۔ اس کیفیت میں روحانیات اور اکتشافات کے موضوع پر ایک سے زیادہ کتابیں لکھ ڈالیں۔ یہ ضرور ہے ان کتابوں میں مربوط اور منظم انداز تحریر بالکل نہیں ملتا۔ زندگی کے بالکل آخری ایام میں وہ خود کو راجہ جے چند

کا اوتار سمجھنے لگے تھے۔ ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں جو بھی تحریر لکھتے اس میں خوش خطی اور دیدہ زیبی بہت ہوتی۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ آزاد نے طالب علمی کے زمانے میں باقاعدہ خوش خطی سیکھی تھی، اور کبھی اپنے اخبار اور کبھی ملازمت کے زمانے میں دوسرے پریس کے لیے وہ پیشہ ورانہ انداز میں خوش خطی اور کتابت کے جوہر دکھلا چکے تھے۔ جب محمد حسین آزاد کی اہلیہ کا انتقال 1905 میں ہوا اسی وقت ان پر جنون کا دورہ اکثر پڑا کرتا تھا۔ 1909 کی بات ہے کہ ان کے خاص شاگرد اور خواجہ میر درد کے نواسے ناصر نذیر فراق ان سے نیاز حاصل کرنے پہنچے تھے۔ جس کے بارے میں ایک واقعہ کا ذکر ان کے جنون کے ذکر میں کیا جا چکا ہے۔ ناصر نذیر فراق نے اس ملاقات کا تفصیلی ذکر کیا ہے جس میں یہ چند سطریں اہم ہیں:

> ''استاذ امام باڑے کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ایک میلی سی اچکن گلے میں تھی جس کی چولی میں پورے بٹن بھی نہ تھے۔ ایسا ہی میلا کچیلا ڈبل زین کا پاجامہ تھا، سر پر مغلئی طرز کی چکٹ ٹوپی اور پاؤں میں بہت ہی بوسیدہ جوتی تھی۔ ایک بوریے کے ادھر اُدھر کچھ راکھ، کچھ کوئلے اور کچھ کوڑا پڑا تھا۔''

از خود رفتگی کی یہ کیفیت محمد حسین آزاد پر آخری تین چار برسوں میں زیادہ طاری رہی۔ اس پر مستزاد یہ کہ بواسیر کی تکلیف جوان کو مدتوں سے لاحق تھی اس میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا اس لیے کھانے پینے سے ان کے جسم میں خون بنتا کم تھا اور بواسیر کے سبب نکل زیادہ جاتا تھا۔ اس وجہ سے آخری دنوں میں نقاہت حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ کچھ کھانے پینے سے رغبت تو تھی نہیں اس لیے زیادہ بھوکے رہتے، البتہ چائے پیتے رہتے۔ اس چائے نوشی نے معدے میں تیزابیت کو بہت بڑھا دیا تھا۔ کئی دنوں تک نیم مدہوشی کی کیفیت رہی اور جسم پوری طرح سے خشک ہو گیا اور اسی عالم میں 12/جنوری 1910 کو عاشورے کی شب وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ نہ قید حیات رہی اور نہ قید جنون — ان کے انتقال کی خبر آناً فاناً ہر طرف پھیل گئی اور مولانا آزاد کے عقیدت مند ہر طرف سے جمع ہونا شروع ہوئے، مگر دوسری صبح چونکہ عاشورے کا دن تھا اس لیے طے یہ پایا کہ تجہیز و تدفین میں ایک روز کا توقف کیا جائے تا کہ وہ

لوگ بھی آ جائیں جو عاشورے کی وجہ سے لاہور سے باہر گئے ہوئے ہیں۔آزاد کے انتقال کے غم میں شہر کے سارے دفاتر اور تعلیمی ادارے بند کر دیے گئے تھے۔ جنازے میں بیسویں ہزار لوگوں کا مجمع تھا اور ہر شخص ماتم کناں نظر آتا تھا۔

محمد حسین آزاد کی وفات محض ایک شخص کی وفات نہ تھی۔ ایک عالم کی وفات عالم کی وفات کے مصداق تھی، پھر یہ کہ ان کی حد درجہ سرگرم فعال اور افسانوی شخصیت ہر انسان کے لیے پُرکشش تھی اور ان کی زندگی اور دلچسپیوں کا تنوع علمی حلقوں میں غیر معمولی اضطراب اور فقدان کا احساس دلانے کا مصداق تھا۔آزاد کے انتقال پر بہت سے لوگوں نے مضامین لکھے، ہر حلقے میں تعزیتی جلسوں کا اہتمام کیا گیا اور کثرت سے قطعات تاریخ لکھے گئے مگر ان کے رفیق خاص خواجہ الطاف حسین حالی نے جو مرثیہ لکھا تھا وہ ہر اعتبار سے نا قابلِ فراموش سمجھا گیا۔ جو کچھ اِس طرح ہے:

آزاد وہ دریائے سخن کا دُر یکتا جس کی سخن آرائی پر اجماع تھا سب کا
ہر لفظ کو مانیں گے فصاحت کا نمونہ جو اس کے قلم سے دم تحریر ہے ٹپکا
ملکوں میں پھرا مدتوں تحقیق کی خاطر چھوڑا نہ دقیقہ نہ کوئی رنج و تعب کا
دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہلِ قلم میں تصنیف کا، تدوین کا، تحقیق کا لپکا
صحت میں، علالت میں، اقامت میں، سفر میں ہمت تھی بلا کی تو ارادہ تھا غضب کا
فرض اپنا ادا کر کے کئی سال سے مشتاق بیٹھا تھا کہ آئے کہیں پیغام طلب کا
آخر شب عاشورہ کو تھی جس کی تمنا آپہنچا نصیبوں سے بلاوا اسے رب کا

تاریخ وفات اس کی جو پوچھے کوئی حالی
کہہ دو کہ ہوا خاتمہ اردو کے ادب کا

حالی کا یہ قطعۂ تاریخ اپنی سلاست، سادگی اور طرفگی کے اعتبار سے آزاد پر لکھی گئی تمام نظموں اور قطعات میں منفرد اور ممتاز معلوم ہوتا ہے جس میں آزاد کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمیٹ لیا گیا ہے۔

ooo

محمد حسین آزاد اور روایتی اردو شعریات

محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' شعرائے اردو کے تذکروں کی تنقیدی روایت کی آخری کڑی بھی ہے اور ادبی تاریخ کے ساتھ ادبی تنقید کی شیرازہ بندی کی ابتدائی کوشش بھی۔ محمد حسین آزاد کی تنقید تذکروں کی طرح انشا پردازی اور شاعرانہ طرز بیان کی مثال بھی پیش کرتی ہے، مگر ساتھ ہی شاعروں کی زبان و بیان اور موضوع و مافیہ کو سامنے رکھ کر محاکمہ کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ کلیم الدین احمد کو آزاد کی تنقید میں خامیاں ہی خامیاں نظر آتی ہیں۔ مگر جب وہ حالی اور آزاد کی زبان کا فرق بتاتے ہیں تو حالی کے بارے میں کہتے ہیں کہ "وہ کام کی باتیں کام کی زبان میں کرتے ہیں۔ آزاد نے زبان میں پرانے تذکروں کی تقلید کی۔ اس لیے کام کی باتیں بھی کام کی زبان میں نہ کر سکے۔ یہاں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ کلیم الدین احمد کی اس بات میں جہاں محمد حسین آزاد کی ایک خامی بیان کی گئی ہے وہیں ایک اعتراف بھی موجود ہے۔ یعنی یہ کہ تنقیدی نقطۂ نظر سے محمد حسین آزاد کام کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ راقم الحروف ان ہی کام کی باتوں کو اردو تنقید کی شیرازہ بندی کی اولین کوششوں میں شمار کرتا ہے۔ جہاں تک آزاد کی زبان کا سوال ہے تو یہ بات غلط نہیں کہ تذکروں کی غیر شیرازہ بند اور غیر منضبط تنقید کے ایک تنقیدی نظام کی شکل اختیار نہ کر سکنے میں اس زبان کا بھی دخل رہا ہے۔ جو

کسی بھی طرح تنقید کی ترجمان کہلانے کی مستحق نہ تھی۔ اس طرح یہ کہنا چاہیے کہ اپنی زبان اور انشاپردازی کے اعتبار سے محمد حسین آزاد کا سلسلہ اپنے ماقبل کے تذکرہ نگاروں سے جاملتا ہے اور تنقیدی خیالات کے نقطۂ نظر سے وہ بعد کی ادبی تنقید کے لیے فضا آفرینی کا کام کرتے ہیں۔ الطاف حسین حالی نے اپنی کتابوں میں محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' سے جو استفادہ کیا ہے وہ ہماری نظروں سے مخفی نہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے غلط نہیں کہا ہے کہ ''مقدمہ'' کے اردو ماخذوں میں سب سے بڑا ماخذ آب حیات ہے۔ جس کا اثر بجا طور پر کتاب میں نظر آتا ہے''۔ آزاد کی اس اثراندازی سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ الطاف حسین حالی سے شروع ہونے والی ادبی تنقید کی فضا محمد حسین آزاد کیوں کر تیار کرتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کے ایک محقق ڈاکٹر اسلم فرخی نے حالی کی تنقید پر آزاد کے اثر کو ایک مثال سے واضح کیا ہے۔ انھوں نے غالب کی شاعری کے بارے میں پہلے آزاد کی رائے لکھی ہے اور اس کے بعد خود اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

> ''آزاد کے بیان کی اثر پذیری اور دلکشی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ غالب کے سلسلے میں ان کے بیشتر بیانات کو حالی نے یہ ادنیٰ تصرف یادگار غالب میں جگہ دی ہے۔ اگرچہ انھوں نے ایک جگہ کے علاوہ اور کہیں آزاد کا حوالہ نہیں دیا۔ حالانکہ آب حیات اور یادگار غالب کے تقابلی مطالعے سے بات واضح ہوجاتی ہے کہ حالی پر آزاد کا اثر بہت گہرا ہے۔''

محمد حسین آزاد عربی اور فارسی کی ادبی روایت کے پروردہ ہیں، اس لیے اس روایت کا جادو ان کے افکار کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ وہ اپنے خیالات، اپنے فرائض منصبی اور سرسید کی تحریک سے کسی حد تک متاثر ہونے کے سبب مغربی شعر و ادب سے استفادے پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں، اس لیے ان پر مغرب کی کورانہ تقلید کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ مگر آزاد کے ان دونوں رویوں کے مابین جو چیز بہت نمایاں دکھائی دیتی ہیں وہ ان کی ناقدانہ اہمیت ہے۔ انھیں یا تو ادب کے مورخ کا نام دیا جاتا ہے یا ادیبوں کے سوانح نگار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اپنی ان دونوں حیثیتوں میں وہ ناقدانہ ذمہ داریوں سے حتی الوسع عہدہ برآ ہونے کی کوشش

کرتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ان تمام تحریروں میں انشا پردازی کی لے بہت تیز ہے۔ اتنی تیز کہ آزاد کو انشا پرداز کی حیثیت سے پیش کرنے کو بالعموم ان کی بنیادی خصوصیت کی پیش کش کے مترادف سمجھ لیا جاتا ہے۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا کہ جو ادیب بڑا انشا پرداز ہوگا اس کے تنقیدی خیالات کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوگی۔ آیئے ان کے تنقیدی خیالات کی قدر و قیمت کو سمجھنے کی غرض سے ان کی بعض کتابوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں۔

محمد حسین آزاد کی تصانیف میں آب حیات، نگارستان فارس، سخن دان فارس کے علاوہ ان کے لکچر ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' کو تنقیدی نقطۂ نظر سے قابل لحاظ قرار دیا جانا چاہیے۔ زمانی ترتیب کے اعتبار سے آزاد کے لکچر کو تقدم حاصل ہے۔ یہ وہ لکچر ہے جو آزاد کے سررشتہ تعلیمات (پنجاب) سے وابستگی کے زمانے میں انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے دیا تھا۔ یہ لکچر ایک معنی میں نظم جدید کی تحریک کا منشور اور پیش خیمہ بھی ہے۔ ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' کے عنوان سے اپنے لکچر میں یوں تو آزاد نے اپنے مطلب کی باتیں بعد کے حصے میں کی ہیں، مگر ابتدائی صفحات میں انھوں نے شعر کی ماہیئت، شاعر کی حیثیت اور شاعر کے تخلیقی عمل سے ملتی جلتی باتیں کی ہیں۔ اس لکچر میں آزاد کو اپنے حدود کا احساس ہے، اس لیے وہ انشا پردازی سے کم کام لیتے ہیں۔ اپنے مافی الضمیر کو وضاحت کے ساتھ اور ٹھوس انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ سب سے پہلے شعر کے معنی و مفہوم کے تعین کی کوشش کرتے ہیں اور اس تعین میں بغیر نام لیے عہد عباسی کے عرب نقادوں کی تعریف شعر پر ایک صفت 'اثر انگیزی' کا اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

> ''کتابوں میں اکثر شعر کے معنی کلام موزوں و مقفیٰ لکھے ہیں۔ لیکن درحقیقت چاہیے کہ وہ کلام موثر بھی ہو، ایسا کہ مضمون اس کا سننے والے کے دل پر اثر کرے۔ اگر کوئی کلام منظوم تو ہو لیکن اثر سے خالی ہو تو ایک ایسا کھانا ہے جس میں کوئی مزا نہیں، نہ کھٹا نہ میٹھا۔''

عرب ناقدین کے درمیان شعر کی تعریف، کلام موزوں و مقفیٰ سے کرنے کا انداز عام رہا ہے۔ اس پر بعض نے بامعنی ہونے کی شرط بڑھائی اور بعض نے شاعر کے ارادے کی شرط

کو اہم قرار دیا، محمد حسین آزاد اس کے مؤثر ہونے پر زور دیتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد کے نزدیک شاعری کے لیے شاعر کے ارادے یا شاعری کے بامعنی ہونے سے زیادہ اس کی اثر انداز ی کو اہمیت حاصل ہے۔ اس سے یہ شبہہ گزرتا ہے کہ ممکن ہے کہ آزاد کے خیال میں شعر کے لیے بامعنی ہونے کی قید غیر ضروری ہو، مگر ایسا نہیں ہے۔ دراصل آزاد کلام موزوں ومقفیٰ کے موثر ہونے کو بامعنی ہونے کا مترادف بھی سمجھتے ہیں اور اس کا نعم البدل بھی۔ آزاد اپنے لکچر میں شعر کی تعریف کرنے کے بعد شعر کے بعض ان مباحث کا ذکر چھیڑتے ہیں جو مشرقی شعریات میں بالعموم اہم سمجھے جاتے رہے ہیں۔ وہ یہ تو نہیں کہتے ہیں کہ شاعر ''تلامیذ الرحمٰن'' ہوتے ہیں مگر وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کا مفہوم ومدعا یہی ہے۔ ان کے نزدیک شاعری کسبی چیز نہیں، وہ شاعری کو وہبی صلاحیت سمجھتے ہیں، شاعر ان کے خیال میں اپنی وہبی صلاحیت کا استعمال کر کے لفظ ومعنی اور زبان وبیان پر مالکانہ تصرف کا حقدار ہو جاتا ہے:

> ''...... فی الحقیقت شعر ایک پرتو روح القدس کا اور فیضان رحمت الٰہی کا ہے کہ اہل دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ظاہراً اپنے کلبۂ احزان میں پڑا رہتا ہے مگر تمام عالم میں اس طرح حکومت کرتا ہے جیسے کوئی صاحب خانہ اپنے گھر میں پھرتا ہے۔ پانی میں مچھلی اور آگ میں سمندر ہو جاتا ہے۔ ہوا میں طائرانہ بلکہ آسمان پر فرشتہ کی طرح نکل جاتا ہے۔ جہاں کے مضامین چاہتا ہے بے تکلف لیتا ہے اور یہ تصرف مالکانہ اپنے کام میں لاتا ہے۔ زہے سعادت اس کی جسے ایسے ملک معنی کی سلطنت نصیب ہو۔''

اس چھوٹے سے ٹکڑے میں کئی اہم باتوں کی طرف اشارے ملتے ہیں، شعر کو پرتو روح القدس اور فیضان رحمت الٰہی کہنا، ثابت کرتا ہے کہ آزاد شاعری کو ایک وہبی چیز سمجھتے ہیں اور اس کا مخاطب اہلِ علم یا صرف ان لوگوں کو گردانتے ہیں جو اہل دل ہوتے ہیں۔ اگلے جملوں میں وہ شاعر کو تمام عالم میں حکومت کرنے والا اور پورے عالم کو شاعر کے لیے ایک ایسے گھر کی مانند بتاتے ہیں جس کے جس حصے میں وہ جانا چاہے، جا سکتا ہے۔ اس بات سے آزاد، شاعر کی قوتِ تخیل کی دسترس ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں کسی مالک مکان کو اپنے مکان پر

ایسا تصرف حاصل ہوتا ہے جسے آپ مادی تصرف کا نام دے سکتے ہیں مگر شاعر کو پوری کائنات پر ذہنی اختیار حاصل ہوتا ہے۔ یہی اختیار اس کے لیے واہمہ بھی ہے، تصور بھی اور تخیل بھی۔ جب آزاد یہ کہتے ہیں کہ ''جہاں کے مضامین چاہتا ہے، بے تکلف لیتا ہے اور یہ تصرف مالکانہ اپنے کام میں لاتا ہے۔'' تو ان کی مراد اس جملے سے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ شاعر اپنی فنی کی صلاحیت سے اَن دیکھی چیزوں کو دیکھی ہوئی اور بعض غیر مربوط اور لاتعلق اشیا میں ربط کی جستجو کر کے انھیں اپنے تخیل کے ذریعے مربوط اور باہم ہم رشتہ بنا کر پیش کر سکتا ہے۔ تخیل کی بحث حالی اور شبلی، نے بہت تفصیل سے اپنی کتابوں میں کی ہے۔ آزاد اس اہم شعری مسئلے پر با‍‌قاعدہ بحث نہیں کرتے مگر بعض ایسے اشارے ضرور کر گزرتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان مسائل سے پوری طرح باخبر تو ہیں لیکن اپنی کتابوں کے موضوعات کی پابندی کے سبب ان پر پوری توجہ صرف نہیں کر پاتے۔ زبان و بیان پر شاعر کی قدرت اور اشیا پر تخلیقی تصرف کا ذکر آزاد جگہ جگہ کرتے ہیں۔ وہ تخیل تصور یا واہمہ کی اصطلاحات کا استعمال نہیں کرتے مگر شاعرانہ قدرت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں گویا وہ ان اصطلاحات کی مدد کے بغیر اپنی بات لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں:

> ''شاعر اگر چاہے تو امورات عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائے۔ پتھر کو گویا کر دے۔ درختان پادر گل کو رواں کر دکھائے، ماضی کو حال، حال کو استقبال کر دے، زمین کو آسمان، خاک کو طلا، اندھیرے کو اجالا کر دے، اگر غور کر کے دیکھو تو اکسیر اور پارس اس کو کہنا چاہیے کہ جسے چھو جائے سونا ہو جائے۔''

امورات عادیہ کو نیا کر دکھانا، پتھر کو گویا، درختوں کو رواں، ماضی کو حال اور حال کو استقبال کر دکھانا، یا زمین کو آسمان اور مٹی کو سونا بنا کر پیش کرنا، یہ ساری باتیں تخیل کی غیر معمولی قوت اور زبان و بیان پر بے انتہا قدرت کی علامتیں ہیں۔ شاعر کے لیے اس نوع کی قدرت کا بیان فارسی کے معروف شاعر اور ناقد نظامی عروضی سمرقندی نے یہ کہہ کر کیا ہے کہ ''شاعری صناعتے است کہ شاعر بداں صناعت اتساق مقدمات موہمہ کند والتسام قیاسات

منتجہ، برآں وجہ کہ معنی خرد را بزرگ گرداند و معنی بزرگ را خرد، و نیکو را در خلعت زشت باز نماید وزشت را در صورت نیکو جلوہ کند۔ محمد حسین آزاد، اپنے خیالات میں فارسی اور عربی کے علمائے شعر سے متاثر ہونے کے ساتھ اپنی اختراعی قوت کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ ''امورات عادیہ کو نیا کر دکھانے'' کی بات کہہ کر ایک ایسا نکتہ پیش کر دیتے ہیں جو شاعری کی اصل ماہیئت ہے۔ یونانی مفکروں کے نزدیک شاعری نقل ہے، بعض کے نزدیک نقل کی نقل ہے اور بعض کے خیال میں اشیا کی باز آفرینی ہے۔ عرب ناقدین نے آخر الذکر خیال کو زیادہ ترجیح دی ہے اور اکثر عرب نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ شاعر ایک نئی دنیا کی تخلیق کرتا ہے۔ آزاد یا تو دانستہ طور پر یا پھر اپنی قوت اختراع کے سبب کم وبیش یہی نتیجہ نکالتے ہیں اور شاعری کو زندگی یا اشیا کی تخلیق نو قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاعری کا یہی خاصہ اسے ہمیشہ تازہ رکھتا ہے اور اس کے الفاظ کی ہمہ جہتی اس کی شاعری پر قدامت کی گرد نہیں جمنے دیتی۔

محمد حسین آزاد جس طرح شاعری کو ایک مابعدالطبیعاتی چیز سمجھتے ہیں، اسی طرح وہ شاعری کا رشتہ اخلاقیات سے بھی جوڑ دیتے ہیں۔ وہ حالی اور شبلی کی طرح اخلاقیات اور شاعری کے رشتے پر تفصیلی بحث نہیں کرتے مگر وہ حالی کے طرفدار ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فحش مفاہیم اور ناشائستہ خیالات کی شاعری کو شاعری سے موسوم ہی نہیں کرنا چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور فن شعر گوئی کو گمراہی سے تعبیر کرنے والے نقادوں کے ہم خیال ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک صرف وہ شاعری گمراہی کے مترادف نہیں ہے جس میں صالح اقدار اور اخلاقی اعتبار سے پسندیدہ خیالات کا اظہار کیا گیا ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ قرآن کا بیان ''**الشعراء یتبعهم الغاؤن......**'' الخ ہر لحہ ان کے سامنے ہے اور صدر اسلام میں شاعری کے بارے میں جو خیالات قرآن کے زیر اثر عام رہے، ان سے آزاد پورے طور پر اتفاق کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک بھی ایسی شاعری جواز کے حدود میں آتی ہے جس سے خبث طبیعت کا اظہار نہ ہوتا ہو:

> ''......اکثر اشخاص علی العموم فن شعر گوئی کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے۔ لیکن جو لوگ اصل سخن کو پہنچے ہوئے ہیں وہ

جانتے ہیں کہ اگر صناع خبثِ طبیعت سے صنعت کو بری طرح کام میں لائے تو اصل صنعت پر الزام نہیں آسکتا... شاعروں کی بدزبانی و بدخیالی سے "شعر" بھی تہمت کفر سے بدنام نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت ایسے کلام کو شعر کہنا ہی نہیں چاہیے کیوں کہ شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوش وخروش سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے، اور اسے قوت قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلہ خاص ہو۔ خیالات پاک جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں، مرتبۂ شاعری کو پہنچتے جاتے ہیں۔"

(آبِ حیات)

اس اقتباس میں آزاد نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے اختلاف یا اتفاق اپنی جگہ، مگر ان چند جملوں میں ایک ساتھ آزاد نے شاعری کے لیے ایسے کئی نکات واضح کیے ہیں جو مزید وضاحت کے متقاضی ہیں۔ تاہم تفصیل سے احتراز کرتے ہوئے بعض نکتوں کی نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آزاد اپنے تنقیدی خیالات میں عموماً انداز بیان، اسلوب اور لفظی محاسن پر نظر رکھتے ہیں۔ مگر یہاں سرِّ معنی سے واقفیت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ معنی ومفہوم کے اسرار کو ہی اصل سخن بھی سمجھتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کے نزدیک شاعری دوسرے علوم سے مختلف ہے۔ اسے وہ صنعت کا نام دیتے ہیں۔ (پچھلے صفحات میں آپ نے دیکھا ہے کہ نظامی عروضی سمرقندی بھی "شاعری صناعتے است") کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔) تیسری چیز یہ کہ اخلاقی اعتبار سے برے اور ناپسندیدہ خیالات سے مملو شاعری آزاد کے نزدیک، دائرہ شاعری سے باہر ہے۔ اور آخری نکتہ یہ ہے کہ آزاد اپنے پورے تنقیدی رویے کے خلاف یہاں یہ بتاتے ہیں کہ شاعری کا نقطۂ کمال درحقیقت پاکیزہ اور عمدہ خیالات کی بلندی ہے۔ آزاد اپنی تنقید میں زبان وبیان، صفائے کلام، روانی، برجستگی، فصاحت وبلاغت اور اثر اندازی وغیرہ وغیرہ کو شاعری کا نقطۂ کمال بتاتے ہیں۔ یہاں وہ سب سے اہم معیار یہ مقرر کرتے ہیں کہ کسی شاعر کا شعری ارتقا دراصل خیالات کی روز افزوں پاکیزگی اور اخلاقی ارتقا کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ رویے کا یہ تضاد درحقیقت تنقیدی خیالات کا تضاد نہیں معلوم ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ آزاد خبث طبیعت کے اظہار

کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کرنے میں اور قوت قدسیہ الٰہی سے شاعری کا سلسلہ خاص ثابت کرنے کے جوش میں بعض ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جو ان کے مجموعی نظریۂ شعر سے ہم آہنگ نہیں۔ محولہ بالا اقتباس میں شعر کی تعریف کرتے ہوئے، اسے اس کلام سے تعبیر کرنا، جو جوش وخروش سے پیدا ہوا ہے، بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ جوش وخروش کے ساتھ سنجیدگی کی صفت بجائے خود ایک سرکش گھوڑے کو لگام سے قابو کرنے کے مترادف ہے۔ یہ بات غماز ہے محمد حسین آزاد کے اس خیال کی کہ وہ ساری اخلاقی قدغن لگانے کے باوجود شاعری کے لیے جوش وخروش کی شرط سے انکار نہیں کرنا چاہتے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ شاعری کی تعریف میں اخلاقی پابندی بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور شاعر کی آزادہ روی سے بھی انکار نہیں کر پاتے۔

آب حیات کو محمد حسین آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ خیال کیا جاتا ہے۔ اپنی تمام کمیوں اور تاریخی تسامحات کے باوجود اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ آب حیات کے نام سے تذکرہ نگاری کے دور کے بعد وہ کتاب سامنے آئی جسے صحیح معنوں میں تنقیدی یا تاریخی تصنیف کا نام دیا جا سکتا۔ تاریخ نویسی خود اپنی جگہ پر ایک تنقیدی عمل ہے۔ شاعر کی قدر و قیمت کے تعین، شاعری کی پرکھ اور شاعری کے ادوار کی نمایاں خصوصیات کے شعور کے بغیر تاریخ ادب لکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ آب حیات پر رائے دیتے ہوئے ہمارے نقاد عام طور پر یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ جہاں آب حیات کے بعد اردو تنقید کی اب تک سب سے اہم کتاب ''مقدمہ شعر وشاعری'' لکھی گئی وہاں آب حیات سے پہلے فارسی اور اردو میں تذکرہ نویسی کی ایسی روایت دور تک پھیلی ہوئی ہے جس میں نہ تنقید کی مخصوص زبان ملتی ہے، نہ وضاحت ملتی ہے اور نہ تنقیدی تصورات کو کسی سسٹم میں پیش کرنے کی کوئی کوشش نظر آتی ہے۔ آزاد اسی روایت کے پروردہ ہیں اس لیے اس روایت کے نقائص کا ان کی کتاب میں کسی حد تک در آنا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ آزاد اپنے تنقیدی خیالات کے اظہار میں پرانے تذکرہ نویسوں سے کچھ آگے نظر آتے ہیں یا نہیں؟ پرانے تذکروں کے تناظر میں اس کا جواب اثبات میں ہوگا۔ آزاد، پرانے تذکرہ نویسوں سے اس معنی میں بھی آگے ہیں کہ آزاد

نے سب سے پہلے ادبی تنقید کے نظریاتی مباحث کا آغاز کیا۔ وہ اس لیے بھی قابل توجہ ہیں کہ انھوں نے عام تذکروں کے برخلاف بہت سے شاعروں کی انفرادیت کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ ان کی یہ اہمیت بھی ہے کہ وہ اپنے ماقبل کے تذکروں کی طرح صرف شاعروں کا انتخاب کلام یا اس پر تعمیم زدہ رائے نہیں دیتے بلکہ شاعروں کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے بھی دیکھتے ہیں اور شاعروں کی الگ الگ خصوصیات کے ساتھ کسی خاص دور کی خصوصیات کے تعین کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ وہ آب حیات میں شعرا کے دورِ اوّل پر بحث کرتے ہوئے اس فرق تک بھی پہنچنا چاہتے ہیں کہ آخر ولی اپنے ہم عصروں سے اس حد تک مختلف ہو گئے کہ انھوں نے ان کے برخلاف ایہام گوئی کو اپنانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ پھر وہ ولی اور ان کے معاصرین پر رائے دیتے ہوئے بعض مشترک خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان کے فطری انداز کو شاعری کے ایام طفولیت کی معصومیت سے تعبیر کرتے ہیں:

> ''ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں، جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے دل میں جو خیالات گزرتے ہیں، وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ اینچ پیچ کے خیال، دور دور کی تشبیہیں، نازک استعارے نہیں بولتے۔ اس واسطے اشعار بھی صاف اور بے تکلف ہیں، اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ہر ایک زبان اور اس کی شاعری جب تک عالم طفولیت میں ہوتی ہے۔ تب تک بے تکلف، عام فہم اور اکثر حسب حال ہوتی ہے۔ اسی واسطے سے لطف انگیز ہوتی ہے۔'' (آبِ حیات)

اس اقتباس میں ولی اور اس کے ہم عصروں کی شاعری میں جن مشترک صفات کا ذکر کیا گیا ہے وہ ساری کی ساری وہی صفات ہیں جو فارسی اور عربی کے علمائے نقد اور ان کے اثر سے اردو کے تذکرہ نگار زیر بحث لاتے رہے ہیں۔ مشاہدات، خیالات، نازک استعارات، دور دور کی تشبیہات، صفائی، بے تکلفی، لطف انگیزی کے علاوہ شاعری کے ''عام فہم'' اور ''حسب حال'' ہونے جیسی لفظیات اور اصطلاحات مشرقی شعریات کا حصہ رہی ہیں۔ آزاد اپنی

تمام جدت پسندی اور مغرب کی تقلید کے باوجود مشرقی تنقید کے پیانوں سے اثر پذیری کا شعوری یا غیر شعوری اظہار کر جاتے ہیں۔ آب حیات کے صفحات میں مختلف شاعروں پر محاکمہ کرتے ہوئے آزاد عربی اور فارسی کی تنقیدی روایت کے اسیر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی تنقید کا ڈھانچہ، ان کی لفظیات، ان کے نزدیک شاعری کے محاسن اور معائب اور سب سے اہم چیز یہ کہ ان کی تنقید کا پورا ایڈیم، عربی اور عربی سے بھی کچھ زیادہ فارسی کی تنقیدی روایت کے زیر اثر مرتب ہوتا ہے۔ ذیل کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے۔ انشا کے مجموعۂ کلام کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''غزلوں کا دیوان عجب طلسمات کا عالم ہے۔ زبان پر قدرتِ کامل، بیان کا لطف، محاوروں کی نمکینی، ترکیبوں کی خوش نما تراشیں، دیکھنے کے قابل ہیں۔''

(آب حیات)

وہ ناسخ کی غزلوں کا موازانہ بعض فارسی شاعروں سے کرتے ہیں۔ آزاد، ناسخ کی خصوصیات کو ان کی وجہ تسمیہ بتا دیتے ہیں:

''غزلوں میں شوکتِ الفاظ، بلند پردازی، اور نازک خیالی بہت ہے اور تاثیر کم، کلیم صائب کی تشبیہ و تمثیل کو اپنی صنعت میں ترتیب دے کر ایسی دست کاری اور مینا کاری فرمائی کہ بعض موقع پر بیدل اور ناصر علی کی حد میں جا پڑے اور اردو میں وہ اس سبب سے صاحب طرز قرار پائے۔ انھیں ناسخ کہنا بجا ہے۔ کیونکہ طرز قدیم کو نسخ کیا۔'' (آب حیات)

آزاد، انیس اور دبیر کی شاعرانہ خصوصیات کا ذکر انیسیوں اور دبیریوں کی زبان سے اس طرح کرتے ہیں:

''دونوں باکمالوں کی خصوصیات مختصر طور پر یوں بیان کی جا سکتی ہیں۔ میر انیس صفائی کلام، حسنِ بیان اور لطف محاورہ میں بے مثال ہیں۔ کلام سہل ممتنع ہے۔ اصولِ فن بزرگوں سے حاصل کیے ہیں۔ کم گو ہیں، پڑھنے میں جواب نہیں رکھتے۔ مرزا دبیر، شوکت الفاظ، بلند پردازی، اور تازگی

مضامین کے بادشاہ ہیں، یہ آیتیں اور حدیثیں خوب نظم کرتے ہیں۔
نہایت پُر گو ہیں۔'' (آبِ حیات)

اگر صرف مندرجہ بالا تین چار شاعروں کی شاعرانہ خصوصیات پر غور کرلیا جائے تو بہ آسانی محمد حسین آزاد کی تنقید کے سلسلۂ نسب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انشا کے بیان میں دیوان کو ''طلسمات کا عالم'' کہنا زبان پر قدرت اور بیان کے لطف کی بات کرنا، محاوروں کی نمکینی اور ترکیبوں کی خوش نمائی پر زور دینا، یہ ساری باتیں قدیم یونانی طرزِ تنقید سے بھی مختلف ہیں اور مغرب کی نسبتاً جدید تنقید سے بھی آشنائی نہیں رکھتیں۔ظاہر ہے کہ اس کے ڈانڈے فارسی کی تنقید سے ملتے ہیں۔ اسی طرح ناسخ کی غزلوں میں شوکت الفاظ، بلند پروازی اور نازک خیالی کی افراط اور دوسروں کی تمثیل وتشبیہ کونہایت صناعی سے ناسخ کا اپنے کلام میں استعمال کرلینا ایک طرف آزاد کے مشرقی معیارِ نقد کو پیمانہ بنانے کی مثال پیش کرنا ہے اور دوسری طرف بیدل اور ناصر کی فارسی کی غزلوں سے ناسخ کی غزلوں کے قدوقامت کی پیائش بجائے خود فارسی روایت کے شعور رکھنے اور اس کو معیار سمجھنے کا احساس دلاتا ہے۔ناسخ پر آزاد نے جس رائے کا اظہار کیا ہے اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ آزاد کی تنقیدی رائیں تذکرہ نویسوں کی رایوں سے کس حد تک اور کیوں کر مختلف ہیں، شعرائے اردو کے تذکرہ نگاروں نے جس شاعر میں خوبیاں ڈھونڈیں اس میں انھیں خامیاں نام کو بھی نہ ملیں ، اور جس شاعر کو انھوں نے نقائص کا مجموعہ سمجھا اس میں محاسن کا نام ونشان تک ان کو نہ ملا۔آزاد، ان کے برخلاف جہاں شاعر کے محاسن بیان کرتے ہیں وہاں نقائص کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ وہ ہیرو پرستی کا ثبوت اپنی پوری کتاب میں دو ایک جگہ تو ضرور دیتے ہیں مگر یہ رویہ ان کی تنقید کا عام رویہ نہیں ہے۔وہ ناسخ کی تعریف شوکت الفاظ ،بلند پروازی اور نازک خیالی جیسی صفات سے کرتے تو ہیں مگر یہ کہنے سے باز نہیں آتے کہ ان کے یہاں تاثیر کی کمی ہے۔ تاثیر کی کمی کی بات آزاد کی تحریر میں ایک خاص سیاق وسباق رکھتی ہے۔آپ نے ابھی پچھلے صفحات میں ملاحظہ کیا ہے کہ آزاد شعر کے لیے موزوں ومقفیٰ ہونے کے ساتھ مؤثر ہونے کی شرط کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ جب آزاد کے نزدیک مؤثر ہونا

شاعری کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک ٹھہرا تو ناسخ کے کلام میں تاثیر کی کمی کی بات، ایک بہت اہم اور بنیادی نقص کی نشاندہی بن جاتی ہے۔

آزاد نے انیس اور دبیر کی منفرد خصوصیات کے بیان میں بھی ساری اصطلاحات فارسی تنقید سے مستعار لی ہیں۔ انیس کے کلام میں صفائی، حسن بیان، لطف محاورہ اور اس کا سہل ممتنع ہونا، اور دبیر کی شاعری کے لیے شوکتِ الفاظ، بلندی پروازی، تازگیٔ مضامین اور پُرگوئی کی باتیں، فارسی کی تنقیدی روایت کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ وہی زبان، وہی اصطلاحات اور وہی تنقیدی ایڈیم۔ کسی خاص روایت سے اثر قبول کرنے کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' اور اپنی کتاب ''آب حیات'' کے علاوہ محمد حسین آزاد نے اپنے تنقیدی رایوں کا اظہار نگارستان فارس اور ''سخن دان فارس'' میں بھی کیا ہے۔ اوّل الذکر کتاب (نگارستان فارس) قریب قریب اسی پیٹرن پر لکھی گئی ہے۔ جس پیٹرن پر شبلی کی کتاب ''شعرالعجم'' لکھی گئی۔ نگارستان فارس لکھی بہت پہلے گئی اور شائع ''شعر العجم'' کی اشاعت کی بہت عرصہ کے بعد ہوئی۔ اس کتاب کی بعد از وقت اشاعت نے اس کی تنقیدی اہمیت کو پورے طور پر سامنے نہ آنے دیا اور اسے بالعموم شعرالعجم جیسی ایک کتاب کا نام دے کر نظرانداز کر دیا گیا۔ نگارستان فارس میں آزاد نے فارسی شعرا کی شاعرانہ قدر و قیمت کا جائزہ لیا ہے مگر اس میں شعرالعجم جیسی وضاحت اور تفصیل نہیں ملتی۔ مگر اپنی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے نگارستان فارس فارسی شاعری پر اردو میں سب سے پہلی اہم تنقیدی کاوش قرار دی جا سکتی ہے۔ آزاد اپنی شاعرانہ نثر کو تنقید کی زبان کے طور پر استعمال کر کے بہت سے تنقیدی نکات پر گویا پردہ ڈال دیتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی بعض بنیادی خصوصیات کی طرف اشارے بھی کر جاتے ہیں۔ یہاں صرف ایک اقتباس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ آزاد فردوسی کے شاہنامہ اور نظامی کے سکندر نامہ کا موزانہ ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:

> ''نظامی نے جو شاہ نامے پر سکندر نامہ لکھا ہے۔ فرق یہ ہے کہ فردوسی کے مضامین بلند، الفاظ زبردست، ترکیب چست، محاورہ صاف ہے۔ اور نظامی،

مضامین کو سنبل و نسرین سے رنگین اور مشک وغیرہ سے معطر کرتا ہے۔''

(نگارستانِ فارس)

مضامین، الفاظ، تراکیب اور محاوروں پر زور، آزاد کے جس رجحان طبع کو سامنے لاتا ہے وہ ہماری نظر سے مخفی نہیں۔ کم بیش اسی رجحان کی نمائندگی ان کی کتاب ''سخن دان فارس'' کے دوسرے حصے سے بھی ہوتی ہے۔ سخن دان فارس کو عام طور سے تقابلی لسانیت کی کتاب سمجھا جاتا رہا ہے جبکہ یہ بات صرف اس کے پہلے حصے پر صادق آتی ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں آزاد کے جو لکچر شامل ہیں، ان میں سے بعض پورے طور پر تنقیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تقاریر میں آزاد کا تنقیدی رویہ چونکہ فارسی کے چند موضوعات کے حوالے سے سامنے آتا ہے اس لیے ان میں موضوعات کی مناسبت سے نقطۂ نظر بھی مشرقی اختیار کیا گیا ہے۔ مشرقی تنقید کا یہی نقطۂ نظر آزاد کی پوری تنقید میں نمایاں ہے۔ سوائے ان مقامات کے جہاں آزاد نے شعوری طور پر مغربی ادبیات کے محاسن کو معیار بنانے کی کوشش کی ہے۔

فردوسی کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں کہ:

''صاف نظر آ رہا ہے کہ روانیِ بیان، شستگیِ زبان، نشستِ الفاظ، چستیِ بندش اور ادائے مطلب کا اسلوب جو فردوسی کے کلام میں ہے، وہ قدرتی جوہر ہے...... اس کی انشا پردازی، استعاروں سے رنگینی اور صنعتوں سے مینا کاری نہیں مانگتی۔ صاف صاف شعر، سادہ سادہ لفظ، محاورے کی باتیں، سلیس زبان، قدرتی نہر میں چشمۂ خداداد کا پانی بہتا چلا جاتا ہے۔'' (سخن دان فارس)

اب ذرا گزشتہ صفحات کے معروضات اور آزاد کے تنقیدی خیالات کی روشنی میں کلیم الدین احمد کی اس رائے پر غور کیجیے تو اس کی اصل حقیقت بہ آسانی معلوم ہو سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آزاد میں نقد کا مادّہ مطلق نہ تھا۔ نظر مشرقی حدود میں پابند تھی۔ وہ لکیر کے فقیر تھے۔ باریک بینی اور آزاد خیالی سے مبرّا، انگریزی لالٹینوں کی روشنی ان کے دماغوں تک نہیں پہنچی تھی۔ ان کی رائے اکثر گول ہوتی تھی۔''

(اردو پر ایک تنقید)

حیرت ہوتی ہے کہ کلیم الدین احمد نے انگریزی لالٹینوں کی روشنی آزاد کے دماغ تک نہ پہنچنے کی وجہ سے، ان کو تنقید کی صلاحیت سے ہی عاری قرار دے دیا۔ آزاد میں نقد کا مادّہ کتنا تھا اس کے ثبوت کے لیے پچھلے صفحات کا مطالعہ کافی ہوگا۔ جہاں تک آزاد کی نظر کے مشرقی حدود میں پابند ہونے کی بات ہے تو یہ بات غلط نہیں۔ اور یہ بات بھی بہت غلط نہیں کہ آزاد کی رائیں اکثر گول ہوتی ہیں۔ مگر ان کمیوں کی وجہ سے ان کے تنقیدی شعور سے انکار کر دینا صرف مغرب کے تنقیدی تصورات کی تقلید کو ادبی تنقید کہنے کے مترادف ہے۔ البتہ آزاد کے خیالات میں انتشار ضرور ہے۔ انھوں نے تنقیدی مسائل پر حالی کی طرح مبسوط بحثیں نہیں کیں۔ ان کے یہاں نظم وضبط کی بھی کمی ہے۔ مگر ان تمام کمیوں کے باوجود آزاد کی تنقید مشرقی معیار نقد کا نمونہ پیش کرتی ہے اور اردو تنقید کو تذکروں کی دنیا سے کئی قدم آگے لے جاتی ہے۔

○○○

اردو تنقید، محمد حسین آزاد اور نوآبادیاتی مضمرات

اردو میں نئی ادبی تنقید، دراصل الطاف حسین حالی کی مرتب کردہ اردو شعریات کی توسیع ہے۔ سو سال کے عرصے میں یوں تو اس شعریات میں مغربی نظریاتِ شعر کے اَن گنت عناصر شامل ہو گئے ہیں مگر اس کی لسانی اور تہذیبی بنیادیں اردو کی مشرقی روایت میں ہمیشہ پیوست رہیں۔ خود الطاف حسین حالی نے ملٹن کے حوالے سے سادگی، اصلیت اور جوش پر مبنی جن ترجیحات کو اردو شعریات کا حصہ بنانے کی کوشش کی تھی وہ امتدادِ وقت کے ساتھ منہا ہوتے چلے گئے۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں اردو تنقید میں پہلے رومانی اور بعد میں ترقی پسند رویّے حاوی رہے ہوں یا نصف آخر میں اس کے ساتھ حقیقت پسندانہ اور پھر ہیئت پرستانہ عناصر شامل ہوئے ہوں، نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ اردو کے نظریاتِ شعر میں تنوع پیدا ہوا اور تقریباً ہر طرح کے تصوّرات کے کارآمد عناصر اردو شعریات میں نہ صرف یہ کہ حل ہو گئے، بلکہ اس کی جزوی توسیع کا حصہ بنتے رہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مغرب سے اثر پذیری کے طویل تجربے کے باوجود اردو کی اپنی شعریات پر قائم رہنے یا اس کی بازیافت کی ضرورت ہر زمانے میں محسوس کی گئی۔ یہ وہی شعریات ہے جس کے وسیلے سے شعر و ادب کے تعینِ قدر میں اردو کے ان لسانی اور تہذیبی رشتوں پر اصرار بڑھا ہے جن کے اصل سرچشمے فارسی یا ہند اسلامی روایت

کے علاوہ کہیں اور تلاش نہیں کیے جاسکتے۔ چنانچہ آج بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں مغرب کے نظریاتی تنوع سے استفادے اور اس سے متعلق بحث وتمحیص کے باوجود اردو کی جدید تنقید کا ارتقا اپنی مخصوص بنیادوں پر ہی استوار رہا۔

محمد حسین آزاد کو اصطلاحی معنوں میں ایک باقاعدہ تنقید نگار کا نام دیا جائے یا نہ دیا جائے، مگر اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ انھوں نے اردو تنقید کے لیے بعض نظریاتی بنیادیں فراہم کیں اور اردو شاعری کی تاریخ رقم کرتے ہوئے اپنی بساط بھر شاعروں کی تنقیدی درجہ بندی کی کوشش بھی کی۔ اس طرح ان کی نظری تنقید کے نمونے بھی ہمارے سامنے موجود ہیں، اور بکھری ہوئی صورت میں سہی، مگر ان کی عملی تنقید کے مختلف عناصر کو بھی مرتب کیا جاسکتا ہے۔ اس موقع پر سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ان کے اصولی مباحث اور اطلاقی تنقید میں ہمیں کوئی مناسبت یا ہم آہنگی بھی ملتی ہے یا نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کے نظریات اور عملی اطلاق میں پائی جانے والی مغائرت، ہمیں ان کے نظری موقف کو کسی اور سیاق وسباق میں سمجھنے اور ان کے مضمرات کا سراغ لگانے پر مجبور کرتے رہے ہوں، اور ہم نے ہنوز اس پہلو کی طرف خاطر خواہ توجہ صَرف ہی نہ کی ہو؟ جہاں تک ان کے تنقیدی تصورات کے مضمرات تک رسائی حاصل کرنے کا سوال ہے تو ان کے بارے میں قرار واقعی رائے اس وقت تک قائم نہیں کی جاسکتی جب تک ان کے نظریے اور اطلاق کی مغائرت کی حرکیات کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ تاہم اس سے پہلے ہمارے لیے ان کی نظری اور عملی تنقید کی نوعیت اور محرکات کو سمجھنا ضروری ہوگا۔

آزاد کی نظری تنقید کے نمونے، نظم آزاد کے دیباچے، 'نظم اردو اور کلامِ موزوں' سے متعلق لکچر، بعض مقالات اور آبِ حیات کے دیباچے میں ملتے ہیں، جبکہ آبِ حیات میں شعری محاسن و معائب کی نشاندہی کو ان کی اطلاقی تنقید کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ہر چند کہ وہ اس ضمن میں جن اصولوں اور معیاروں کو روبہ عمل لاتے ہیں ان کی کوئی نشاندہی ان کی اصولی تحریروں میں نہیں ملتی۔ نظم اور کلامِ موزوں پر گفتگو کرتے ہوئے، انھوں نے شعر کی اثر انگیزی کا اصل محرک موزونیت کو قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں مشرقی تصورِ شعر میں رائج موزوں اور

متقفٰی ہونے کی شرائط پر وہ موثر ہونے کی شرط کا اضافہ کرتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ مشرق کے علوم متداولہ میں تسلیم شدہ انسان کی سب سے بڑی امتیازی صفت 'نطق' کو وہ غیر معمولی طور پر اہمیت دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''پس قوتِ انسانی بھی اس میں کامل سمجھنی چاہیے جس میں قوتِ گویائی کامل ہو۔ چونکہ نظم بنسبت نثر کے زیادہ زور طبیعت سے نکلتی ہے، یہی سبب ہے کہ موثر بھی زیادہ ہوتی ہے۔''

اس طرح معاملہ شعر کی تعریف کا ہو یا لسانی اظہار کی سطح پر انسان کے حیوان ناطق ہونے کا، صاف پتہ چلتا ہے کہ مشرقی تصوّرِ انسان اور تصوّرِ کلام آزاد کی ذہنی اور ادبی نشوونما کا ہی حصہ نہیں بلکہ ان کے خمیر میں شامل ہے۔ یہاں شاید اس بات کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ جس طرح مغرب کے سماجی علوم میں انسان کو ایک سماجی جانور سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے۔ جبکہ مشرق کے عقلی اور نقلی علوم میں انسان کی مابہ الامتیاز خصوصیت قوتِ نطق ہی قرار دی جاتی رہی۔ اسی باعث اس کی تعریف حیوانِ ناطق کے لفظوں میں کی گئی ہے۔ اس کا جدید سباق و سیاق یہ بنتا ہے کہ کمال ابودیب نے عبدالقاہر جرجانی کے تصوّر استعارہ پر گفتگو کرتے ہوئے جدید ساختیاتی مفکرین کے مطابق لسانی اظہار یا ڈسکورس کو مشرق میں تسلیم شدہ انسان کی امتیازی صفت، 'قوتِ نطق' کی بازیافت کا نام دیا ہے۔ اس طرح آزاد کا انسان کی قوتِ گویائی کو شعری اظہار کی اساس قرار دینا ان کے تنقیدی نقطۂ نظر کو اردو کی جدید تنقید کے مباحث کے لیے بڑا بامعنی بنا دیتا ہے۔ پھر یہ کہ وہ جب شاعری میں مصوّری کے عناصر کی جستجو کرتے ہیں تب بھی وہ مشرقی شعریات کی پرانی اصطلاح محاکات اور مغربی تصوّرِ شعر میں مقبول شعری طریق کار جیسے امیجری یا پیکر تراشی کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

''شاعر، گویا ایک مصور ہے کہ معنی کی تصویر دل پر کھینچتا ہے اور بسااوقات اپنی رنگینیِ فصاحت سے عکسِ نقش کو اصل سے بھی زیادہ زیبائش دیتا ہے۔ وہ اشیا

جن کی تصویر قلم مصور سے نہ کھنچے یہ زبان سے کھینچ دیتا ہے۔ چنانچہ ہزاروں صفحہ کاغذ بھیگ کر فنا ہوگئے مگر صدہا سال سے آج تک ان کی تصویریں ویسی کی ویسی ہی ہیں۔''

محمد حسین آزاد کے بعض شعری تصوّرات، جدید تنقیدی مباحث کے لیے ہر چند کہ خاصے معنی خیز معلوم ہوتے ہیں مگر ان کا اصل سرچشمہ وہی مشرقی نظریۂ شعر ہے جس کا سلسلہ عربی اور فارسی کی شعریات کے تسلسل کے طور پر اردو شعریات تک پہنچتا ہے۔ یہ روایت ان کے خمیر میں اس حد تک شامل ہے کہ جب تک بعض مصلحتوں کے زیر اثر وہ شعوری کوشش کرکے اپنے بنیادی سرچشموں سے صَرفِ نظر کرنے کی کوشش نہیں کرتے، ان کی تنقید اپنے اصل مآخذ سے منحرف نہیں ہو پاتی۔ انھوں نے شعری زبان کی سحر آفرینی کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے اس میں زبان کے اچنبھانے کے جدید تصوّرِ شعر سے لے کر حقیقت کا التباس پیدا کرنے والے طرح طرح کے جدید شعری طریق کار کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے شاعری کے وسیلے سے شعری زبان کی طلسم کاری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''شاعر اگر چاہے تو امورِ عادیہ کو نیا کر دکھائے؛ پتھر کو گویا کرے، درختان یا در بگل کو رواں کردکھائے۔ ماضی کو حال، حال کو استقبال کردے، دور کو نزدیک کردے، زمین کو آسمان، خاک کو طلا، اندھیرے کو اُجالا کردے——''

آزاد کی ان نکتہ آفرینیوں کو اگر فارسی کی روایت میں تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو اس میں محمد عوفی کی لباب الالباب اور رشید الدین وطواط کے تصوّرات کی گونج ملتی ہے۔ جن کی بہترین تلخیص نظامی عروضی سمرقندی کے الفاظ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

''شاعری صناعتے است کہ شاعر بداں صناعت، اتساق مقدمات موہمہ کند و التیام قیاسات منتجہ، برآں وجہ کہ معنی خرد را بزرگ گرداند و معنی بزرگ را خرد، و نیکو را در خلعت زشت باز نماید و زشت را در صورت نیکو جلوہ کند، و بہ ایہام، قوت غضبانی و شہوانی را برانگیزد تا بداں ایہام طبائع را انقباضے و انبساطے بود و امور عظام را در عالم سبب شود۔'' (چہار مقالہ)

یہ محمد حسین آزاد کا وہ ذہنی اور فکری پس منظر ہے، جس پر اکتفا کرنا وہ گوارہ نہیں کرتے۔ وہ بعض ایسے تصورات سے بھی کسبِ فیض کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے کلاسیکی مغربی تنقید سے ان کی دلچسپی کا التباس پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ ان کے مغربی آخذ پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے، اور اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے کہ آیا وہ صحیح معنوں میں شعریات کے مغربی سرچشموں سے قابلِ اعتبار حد تک واقفیت رکھتے ہیں یا محض سنی سنائی باتوں کو اپنے زورِ بیان کی بنیاد بنالیتے ہیں۔ وہ شعر کی ماہیت کے بارے میں اپنی گفتگو کچھ اس انداز سے شروع کرتے ہیں:

> ''فلاسفۂ یونان کہتے ہیں کہ شعر خیالی باتیں ہیں جن کو واقعیت اور اصلیت سے تعلق نہیں۔ قدرتی موجودات یا اس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے مطلب کے موقعوں پر موزوں کر دیتا ہے۔ اس خیال کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی...... غرض (شعر میں) ایسی باتیں ہیں کہ نہایت لطف دیتی ہیں، انھیں حقیقت سے کوئی غرض نہیں ہے۔ باوجود اس کے صنعت گاہ عالم میں نظم ایک عجیب صفت الٰہی ہے۔ اسے دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔'' (آبِ حیات)

یہ الگ بات ہے کہ یہی ماورائی اندازِ کلام موزوں کے بارے میں اپنے لکچر میں اختیار کر چکے ہیں مگر اس کا حوالہ یونانی فلسفہ نہیں الہام اور القا کی کیفیت ہے:

> ''فی الحقیقت شعر، ایک پرتو روح القدس کا اور فیضان رحمت الٰہی کا ہے کہ اہلِ دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے۔''
>
> (نظم اور کلامِ موزوں......)

یوں تو وہ اپنے اسی لکچر میں شعر کے لیے ''گلزارِ فصاحت کا پھول، گل ہائے الفاظ کی خوشبو، روشنیِ عبارت کا پرتو، علم کا عطر، قوائے روحانی کا جوہر اور روح کے لیے آبِ حیات''، جیسی صفات کو نت نئے انداز میں دُہراتے ہیں، مگر اس قسم کی تمام تعریفات سے سوائے اس کے کچھ اور پتہ نہیں چلتا کہ وہ قدیم مغربی تصوّراتِ شعر کی یا تو غلط تعبیر کرتے ہیں یا ان

پر کچھ اس طرح اپنے اسلوب کی پیوندکاری کرتے ہیں کہ ان کی طباعی پوری طرح کھل کر سامنے آ سکے۔ تاہم یونانی مآخذ سے اُن کے حوالوں کی مدد سے توثیق کرنے کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے۔ ان تصوّرات کے ذکر میں وہ افلاطون یا ارسطو کا ذکر تو نہیں کرتے مگر کلاسیکی یونان کے حوالے کے سبب ہمارا ذہن بلاتوقف یونان کے ان اوّلین نظریہ سازوں کی طرف ہی جاتا ہے۔ ویسے آزاد کے بیانات کی تفصیل میں جایئے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے تصوّرات کی پوری عمارت افلاطون اور ارسطو سے ناکافی واقفیت کی بنیاد پر تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ افلاطون نے Republic میں شاعر کے منصب کے بارے میں ضمنی طور پر ہی سہی مگر دوررَس نتائج کا حامل نظریۂ عینیت پیش کیا تھا اور شاعر پر بحیثیت نقال عینیت سے دو درجے دور ہونے کا فیصلہ صادر کیا تھا، مگر اس کی دوسری تحریروں مثلاً Ion اور Phaedrus میں شعر کی ماہیت کے موضوع پر بعض بنیادی باتیں ملتی ہیں۔ اس کے خیالات کی جامع ترجمانی ان الفاظ میں ملتی ہے:

> ''شاعر جو لکھتے ہیں وہ اپنے فن کے بل بوتے پر نہیں لکھتے، بلکہ اِلقا کے زور پر لکھتے ہیں...... اس لیے کہ ان پر شاعری کی دیوی کا سایہ ہے جیسے سائی بیلو دیوی کے پجاری رقص کرتے ہیں تو وہ اپنے آپے میں نہیں رہتے۔ اسی طرح لکھنے والے حالتِ جنون میں اپنے حسین نغمے لکھ سکتے ہیں''...... یا یہ کہ ''شاعر نازک اور مقدس ہستی ہے، لیکن اس میں قوتِ ایجاد اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس پر الہام ہوتا ہے، اس کے حواس جاتے رہتے ہیں اور وہ ادراک سے دست بردار ہو جاتا ہے۔''

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ افلاطون نے ان الفاظ میں شاعری کی تعریف نہیں کی ہے بلکہ اس پر طنزیہ تبصرہ کیا ہے، جبکہ بعض کا خیال ہے کہ ری پبلک لکھنے کے بعد، ممکن ہے افلاطون کے نقطۂ نظر میں تبدیلی واقع ہوئی ہو۔ یہاں معنویت محض اس بات کی ہے کہ آزاد کے زیرِ بحث تصورات میں یونانی فلسفہ سے استفادہ ملتا ہے یا نہیں؟ تو شاعروں پر دیوؤں کا سایہ ہونے یا الہام قرار دینے میں افلاطونی تصورات کی بازگشت کسی کو بھی سنائی دے سکتی

ہے۔ مگر جہاں وہ شاعری کے موثر ہونے، اس کے وسیلے سے حقیقی صورت حال میں اضافہ ہونے اور اس کی فصاحت سے لطف پیدا ہونے کی باتیں کرتے ہیں وہاں ارسطو کے اس خیال سے استفادہ ملتا ہے، جس میں شاعرانہ نقل کو ایک جمالیاتی عمل بتایا گیا ہے، اور تخیل اور استعارے کی مدد سے شاعری میں حظ و انبساط پیدا کرنے یا اس کے ذریعہ فطرت میں موجود خلا کو پُر کرنے کا نقطۂ نظر ملتا ہے۔ اس طرح تصوّرات، خواہ افلاطون کے ہوں یا ارسطو کے، آزاد نے ان کی ترجمانی کرتے ہوئے ان کے غیر مربوط عناصر کو تحلیل کرنے کی کوشش بالکل نہیں کی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ شعر کی ماہیت کے بارے میں ان کے تصوّرات بعض نمایاں تضادات میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ ہاں یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ آزاد اپنے عہد کے مغرب میں غیر معمولی طور پر مقبول اور رومانی شعری رجحان کے ترجمان بن کر رہ گئے اور ان کے رومانی طرزِ بیان نے ان کے تاثراتی اندازِ فکر میں مزید ماورائیت بلکہ اُلجھاؤ پیدا کر دیا۔

آزاد نے مشرقی اور مغربی تصوّراتِ شعر سے جو غیر مربوط اثرات قبول کیے ہیں ان میں ایک اہم پہلو شعری لسانیات کا بھی ہے، جس کے تحت وہ آبِ حیات میں سنسکرت اور فارسی کے رائج اسالیبِ اظہار کا موازنہ کرتے ہوئے فارسی میں رائج طرزِ بیان کو استعارہ سازی اور بالواسطہ اظہار کا نام دیتے ہیں، اور اس کے مقابلے میں بھاشا کے راست بیانیہ کو زیادہ قابلِ قبول قرار دیتے ہیں۔ دونوں زبانوں کے اسالیب کا موازنہ انھیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے:

> ''دونوں کے رنگ ڈھنگ میں کیا ذوق ہے؟ بھاشا کا فصیح، استعارے کی طرف بھول کر بھی قدم نہیں رکھتا۔ جو جو لطف آنکھوں سے دیکھتا ہے اور جن جن خوش آوازیوں کو سنتا ہے یا جن جن خوشبوؤں کو سونگھتا ہے، انھیں کو اپنی میٹھی زبان میں بے تکلف بے مبالغہ صاف صاف کہہ دیتا ہے۔'' (آبِ حیات)

حیرت کی بات ہے کہ بھاشا کے اسلوب سے آزاد کی رغبت اور اس کے مقابلے میں فارسی کی اسلوبیاتی روایت کو کم تر گردانے کا رویّہ، بالآخر فارسی کے زیرِ اثر اردو میں رائج

اسالیب کی تحقیر پر منتج ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ صرف بھاشا کی دل پذیری پر توقف نہیں کرتے بلکہ اس کی مماثلت انگریزی زبان کے بیانیہ اور تسلسل اظہار میں ڈھونڈھ لیتے ہیں اور یہ تک کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ:

''بے شک مبالغے کا زور یا تشبیہ اور استعارے کا نمک، زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے۔ لیکن نمک اتنا ہی چاہیے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام کھانا نمک۔ اس لیے، تشبیہ اور استعارے ہمارے مطلب میں ایسے ہونے چاہئیں جیسے معرکہ یا دریا یا باغ کی تصویر پر آئینہ۔ کہ اس کی کیفیت کو زیادہ روشن کرے، نہ اتنے آئینے کہ تصویر کا اصل ہی دکھائی نہ دے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں، لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانہ کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھ کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گل دستے، ہار ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں، اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔''

(نظم اور......)

اس پس منظر میں اگر آزاد کے مختلف، متنوع اور متضاد تصورات کے بین السطور پر توجہ صرف کی جائے تو ان کی ترجیحات کو نشان زد کرنا زیادہ مشکل نہیں رہ جاتا۔ پھر بھی اس ضمن میں حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے زیادہ مناسب یہی ہے آزاد کے نظری موقف کے ساتھ ان کی اطلاقی تنقید کو بھی سامنے رکھا جائے۔ ان کی اطلاقی تنقید کے نمونوں کے طور پر ذوق، مومن اور غالب کی شاعری کے بارے میں آزاد کے تنقیدی فیصلوں سے مدد لی جا سکتی ہے۔ کلامِ ذوق میں انھیں جو محاسن نظر آتے ہیں وہ کچھ اور اس طرح ہیں:

''عام جوہر ان کے کلام کا تازگیِ مضمون، صفائیِ کلام، چستیِ ترکیب، خوبیِ محاورہ اور عام فہمی ہے۔''

ان صفات کے ساتھ ذوق کی غزلوں میں انھیں چست بندشیں، برجستہ ترکیبیں، معانی کی بلندی اور الفاظ کی شکوہ ہیں، بہت اہم معلوم ہوتی ہیں، جبکہ غالب کے بارے میں ان کی رائے میں طنز کا لہجہ صاف محسوس کیا جاسکتا ہے:

''جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس سے ہزار درجہ عالم میں کلام بلند ہے بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔''

مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے معنی آفرینی اور نازک خیالی کو غالب کا شیوۂ خاص بتایا ہے۔ ذوق اور غالب کے علاوہ مومن خاں مومن آبِ حیات کے دوسرے ایڈیشن میں ہی سہی مگر ان خوش نصیب شاعروں میں شامل ہو جاتے ہیں جن پر آزاد کی رائے کو تذکروں کی رائج کردہ تعمیم کے بجائے تنقیدی موقف کے تعین کا نام دیا جاسکتا ہے:

''غزلوں میں ان کے خیالات نازک اور مضامین عالی ہیں، اور تشبیہ اور استعارے کے زور نے اور بھی اعلیٰ درجے پر پہنچا دیا ہے۔ معاملات میں ان کا انداز جرأت سے ملتا ہے۔ وہ اکثر اشعار میں ایک شے کو کسی صفت خاص کے لحاظ سے ذاتِ شئے کی طرف نسبت کرتے ہیں، اور اس ہیر پھیر سے عجیب لطف بلکہ معانی پنہانی پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً:

محو مجھ سا دمِ نظارۂ جاناں ہوگا
آئینہ، آئینہ دیکھے گا تو حیراں ہوگا''

متذکرہ آرا کی روشنی میں آزاد کی عملی تنقید بعض تجزیوں اور موازنوں کی بنیاد پر اردو تنقید کی آگے کی منزلوں کا سراغ دیتی ہے۔ وہ خود کو تذکروں کی محض چندگنی چنی اصطلاحوں میں امیر نہیں رکھتے۔ یہ کوئی کم اہم بات نہیں کہ ایک شاعر کو دوسرے سے الگ کرنے کی خاطر اس کی انفرادی پہچان کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ اس طرح تمام حد بندیوں کے باوجود وہ تذکروں کی نام نہاد تنقیدی رایوں پر اضافے کا انداز اپناتے ہیں اور اپنے زمانی سیاق وسباق میں الطاف حسین حالی کے مربوط اور منضبط تنقیدی تصورات کی تمہید ضرور بن جاتے ہیں۔

تاہم ان کی عملی تنقید کو بڑی مشکل سے اطلاقی تنقید کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ جن اصولوں کا اطلاق ہمیں آبِ حیات میں ملتا ہے وہ صرف آزاد کے تحت الشعور میں نظر آتے ہیں، ورنہ ان کی نظری تنقید تو منصوبہ بند طریقے سے نوآبادیاتی نظریہ سازی میں اسیر ہے۔ یہ محمد حسین آزاد کی نظری اور اطلاقی تنقید کی معائرت اور ناقدانہ شخصیت کے تضادات کا ایسا پختہ ثبوت ہے جس کا تجزیہ کرکے ان کی شخصیت پر پڑنے والے مرئی نوآبادیاتی اور غیر مرئی دباؤ کا اندازہ لگانا بہت مشکل نہیں رہ جاتا۔

سوال یہ ہے کہ مشرقی شعریات کے زیر اثر پروردہ آزاد کا ادبی مزاج اور فارسی اور عربی میں رائج شعری تدبیروں کا استعمال اگر ان کے نظریۂ شعر اور تصوّرِ لسانی سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا تو اس کے اصل محرکات کیا ہیں؟ یا وہ اس ضمن میں کس حد تک نوآبادیاتی مقاصد کو آگے بڑھانے میں معاون نظر آتے ہیں؟

محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کی انگریزوں کے ہاتھوں معتوبیت اور پھر شہادت یا خود آزاد کی افتادِ طبع پر اقتدارِ وقت کی ہیبت اور نتیجے کے طور پر اپنی مصلحتوں کے باعث، ان کا نوآبادیاتی طریقِ کار کا آلۂ کار بن جانا یوں بھی غیر متوقع نہیں معلوم ہوتا۔ اس ضمن میں یہ تاریخی حقیقت بھی غور طلب ہے کہ ہندوستان میں انگریزی زبان کے نفاذ اور ذریعۂ تعلیم بنانے کی لارڈ میکالے پالیسی کے برخلاف انجمن کے صدر لائینٹر، دیسی زبانوں کے ذریعہ مغربی تصوّرات کی ترویج کے طرفدار ہیں، جس کو ڈاکٹر محمد صادق نے ''مقامی زبانوں میں ایسا ادب پیدا کرنے کا نام دیا ہے جس میں مغرب کی روح سمائی ہوئی ہو۔'' لائینٹر کے اس موقف کو نوآبادیاتی منصوبہ سازوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اس لیے کہ اس طریقِ کار سے ہندستانیوں کا مانوس ہونا بھی عین متوقع ہے اور ان کا غیر شعوری طور پر مغربی تہذیب کی برتری کا معترف ہونا بھی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ کرنل ہالرائڈ کے عملی اقدامات، لائینٹر کے نقطۂ نظر کو آگے بڑھاتے ہیں اور دونوں مل کر محمد حسین آزاد کے تسلیم شدہ علمی اور ادبی وقار اور اعتبار کو اپنے مقاصد کی تکمیل کا وسیلہ بنانے اور صورتِ حال کا استحصال کرنے میں پوری طرح کامیابی حاصل کرلیتے ہیں۔ چنانچہ نوآبادیاتی ایجنڈے کے مطابق مغرب کی تہذیبی برتری کو تسلیم کرانے کا جو

منصوبہ زیرِ عمل تھا اس کا پہلا مرحلہ اردو والوں کو ان کے اپنے ادب، اپنی تہذیب اور اپنے ماضی قریب کی ثقافت سے برگشتہ کرنا اور اپنے ادب و کلچر کی بے وقعتی کا احساس دلانا تھا۔ خود کرنل ہالرائڈ نے انجمن کے پہلے مناظمے میں جو باتیں کہیں ان کی ہنرمندانہ تکرار محمد حسین آزاد کی ادبی نظریہ سازی میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان کے الفاظ تھے کہ:

"یہ جلسہ اس لیے منعقد کیا گیا تھا کہ نظم اردو جو چند عوارض کے باعث تنزلی اور بدحالی میں پڑی ہوئی ہے، اس کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے جائیں۔"
(آزاد، محمد صادق)

چنانچہ محمد حسین آزاد کے وسیلے سے ان نوآبادیاتی منصوبہ کاروں کے نقطۂ نظر کو منطق اور مدلل اسلوب مل جاتا ہے اور ان کے لکچر اور بعض دوسری تحریروں میں لفٹنٹ گورنر ڈونالڈ لائیٹر اور ہالرائڈ جیسے سربراہوں کے خیالات کی ترجمانی زیادہ قابلِ قبول انداز میں ہونے لگتی ہے جس کا اندازہ ان بعض عبارتوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جن میں آزاد نے اپنی روایت کی تحقیر اور انگریزی شعروادب کی افادیت اور معنویت کو نمایاں کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے:

"عربی فارسی میں اس ترقی و اصلاح کے راستے سالہا سال سے مسدود ہوگئے ہیں۔" (آبِ حیات) یا یہ کہ:

"فارسی کے اثر کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو باتیں بدیہی ہیں اور محسوسات میں عیاں ہیں، ہماری تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ در پیچ خیالوں میں آکر وہ بھی عام تصور میں جا پڑتی ہیں۔ کیونکہ خیالات کے ادا کرنے میں ہم اوّل اشیائے بے جان کو جاندار بلکہ انسان فرض کرتے ہیں۔ بعد میں ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں جو اکثر ملک عرب یا فارس یا ترکستان کے ساتھ مذہبی خصوصیات رکھتے ہیں۔"

واضح رہے کہ یہ 'نیرنگ خیال' کے وہی محمد حسین آزاد ہیں جن کو تمثیلی مضامین کا بنیاد گزار کہا جاتا ہے۔ بہرکیف اردو اور فارسی کے رائج اسالیب کے نقائص کی نشاندہی کے بعد ان

نقائص کے مداوا سے متعلق ان کا لکچر بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً:

''انگریزی زبان ترقی و اصلاح کا طلسمات ہے۔'' یا یہ کہ:

''میں انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب و مضامین کو نثر سے زیادہ خوب صورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈالتے ہیں اور مضمون کی جان پر احسان کرتے ہیں۔۔۔ لیکن، ہمیں کیا۔۔۔ سن کر ترسیں، اپنے تئیں دیکھ کر شرمائیں۔ کاش ہم جو ٹوٹی پھوٹی نثر لکھتے ہیں، اتنی ہی قدرت نظم پر ہو جاوے، جن کے اعلیٰ درجے کے نمونے انگریزی میں موجود ہیں۔''

مگر وہ اپنی عملی تنقید میں اس نوع کے کسی نوآبادیاتی نظریے کو اردو کے مزاج سے عدم مناسبت کے باعث استعمال نہیں کر پاتے اور اپنی نظری اور عملی تنقید کو دولخت بنا لیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان کے نظریہ اور عمل کے مابین ایک خلا پیدا ہوتا ہے جو بالآخر اس مغربی یا نو استعماری نقطۂ نظر سے پُر ہوتا ہے جو نہ ان کا مزاج ہے، نہ تربیت اور نہ افتادِ طبع۔ چنانچہ آزاد کی تنقید، جدید اردو تنقید کے لیے جزوی طور پر بامعنی ہونے کے باوجود کسی فکری انضباط کے بجائے بعض سیاسی محرکات کی نمائندہ بن جاتی ہے۔

OOO

محمد حسین آزاد کی نمائندہ کتابوں کا تعارف

محمد حسین آزاد کی کتابوں کی تعداد یوں تو بہت زیادہ ہے مگر ان کی چند نمائندہ کتابوں کو صحیح معنوں میں ان کی شناخت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس بات کا تذکرہ بار بار آچکا ہے کہ انھوں نے لاہور میں بہت سی درسی کتابیں تیار کیں۔ انھوں نے صحت و تندرستی اور دوسرے سماجی معلومات پر مبنی کتابیں بھی لکھیں، انھوں نے ایک لغت بھی تیار کی، قواعد فارسی اور اردو بھی مرتب کی اور ان کتابوں کے علاوہ اپنی دلچسپی کے مطابق مختلف اوقات میں ہندستانی تاریخ کے بعض واقعات و قصص، فلسفۂ الٰہیات، مکاشفات اور عرب و ایران سے متعلق بھی بہت سے کتابچے شائع کیے۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تمام کتابوں کا مکمل تعارف تو نہیں مگر بعض ایسی کتابیں جو بعد کے زمانے میں مختلف حوالوں سے محمد حسین آزاد کی شناخت بنیں ان پر تعارفی تبصرے بھی قارئین کے سامنے پیش کر دیے جائیں۔ ان کتابوں میں 'آبِ حیات' کو تحقیق و تنقید کے نقطۂ نظر سے، 'نیرنگ خیال' کو انشاپردازی اور تمثیلی اندازِ تحریر کی نمائندگی کے اعتبار سے، 'سخن دانِ فارس' کو فارسی شعر و ادب اور فرہنگ شناس کے سیاق و سباق میں، 'دربارِ اکبری' کو تاریخ نویس کے منفرد طریقِ کار کے پس منظر میں، 'دیوانِ ذوق' کو اعلیٰ تحقیق و تدوین کے نمونے کے طور پر

اور 'نظم آزاد' کو نئی نظم نگاری کا سنگ میل ہونے کے سبب، بعض ایسی تفصیلات سامنے لے آئی جائیں کہ محمد حسین آزاد کا مکمل، بھرپور اور ہمہ جہت تعارف ہمارے سامنے آ جائے۔

آب حیات

'آب حیات' محمد حسین آزاد کی وہ مبسوط تصنیف ہے جس کی بدولت اردو شعر و ادب کی تاریخ میں ان کو بقائے دوام حاصل ہوا۔ یوں تو ان کی دوسری کتابیں مثلاً نیرنگ خیال، سخن دانِ فارس، دربارِ اکبری اور دیوان ذوق کی تدوین کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، لیکن آب حیات کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ اس میں پہلی بار اردو شاعری اور اردو شاعروں کی تاریخ، انتخاب کلام اور شعرا کی شاعرانہ اہمیت کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو اردو شعرا کے تذکروں اور باقاعدہ طور پر لکھی جانے والی وہ اردو تنقید جو الطاف حسین حالی اور شبلی سے شروع ہوتی ہے کہ درمیان کی کڑی بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اردو کی پرانی تنقید میں بہت سے لوگوں نے آب حیات کو اردو کی پہلی تنقیدی کتاب بھی کہا ہے مگر یہ بات پوری طرح مبنی بر حقیقت نہیں اس لیے کہ آب حیات میں آزاد کا اسلوب نگارش اور کثرت سے صفات کا استعمال اس کتاب کی تنقیدی قدر و قیمت کو کم کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کی زبان تنقیدی نہیں ہے۔

ادبی تنقید دراصل اپنے مخصوص تقاضے رکھتی ہے جس میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ایک نقاد کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ شعر و ادب پر گفتگو کرتے ہوئے تعمیمی کلمات سے گریز کرے اور جس شاعر کی قدر و قیمت وہ متعین کرنا چاہتا ہے اس کی انفرادی شناخت اسی طرح

متعین کرے جو اس کو دوسرے شعرا سے مختلف اور الگ قرار دے سکے۔ کہا جا سکتا ہے کہ تنقیدی اصطلاحات کے اعتبار سے اس کتاب میں تعمیمی گفتگو تو ضرور ہے مگر شاعروں کو پہچاننے کے لیے ایسی صفات کا استعمال ملتا ہے جو دوسرے شعرا پر بھی صادق آ سکتی ہیں — تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ آبِ حیات کی تاریخی حیثیت غیر معمولی ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آبِ حیات میں غلط بیانیاں بھی ایسی پیمبرانہ شان سے کی گئی ہیں کہ ان پر صداقت کا گمان گزرتا ہے۔ اب تو یہ بات تقریباً تسلیم شدہ ہے کہ محمد حسین آزاد کے بہت سے وہ بیانات جو مسترد ہو چکے ہیں۔ وہ بھی ان کے اسلوبِ نگارش کی وجہ سے ناقابلِ فراموش ہیں، انھی بنیادوں پر شروع میں یہ عرض کیا گیا کہ آبِ حیات کی تاریخی اہمیت مسلّم ہے اور دوسرے یہ کہ اس کو ہر زمانے میں اردو تذکروں اور اردو کی ادبی تنقید کی درمیانی کڑی قرار دیا جانا چاہیے۔

یوں تو آبِ حیات 1880 میں شائع ہوئی تھی مگر وہ 1875 کے بعد ہی سے وہ اس کی تیاری میں مصروف ہو گئے تھے۔ انھوں نے بہت سے واقف کاروں کو خطوط لکھے، معلومات حاصل کی، نمونہ کلام جمع کیا اور بعض ایسے لکچرز جو مختلف شاعروں پر انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے دیے، ان سب کو بھی آبِ حیات کا حصہ بنایا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ وہ اس دوران شعرا سے متعلق اپنے لکچرز پر نظرِ ثانی بھی کرتے رہے اور بعض پرانی معلومات جن کو مسترد کرنے کی ضرورت تھی ان کو نئی معلومات میں تبدیل کرتے رہے۔ اس طرح ان کی پانچ چھ برسوں کی محنت شاقہ آبِ حیات کی صورت میں 1880 میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس سے پہلے شعرا کے جو تذکرے لکھے جاتے تھے وہ تاریخی اعتبار سے بہت مربوط نہیں ہوا کرتے تھے۔ آبِ حیات میں شاعروں کے ارتقا کا عہد بہ عہد جائزہ لیا گیا ہے۔ اس طرح مختلف ادوار میں شاعری کے بدلتے ہوئے رجحانات بھی زیرِ بحث آ گئے ہیں اور ان پر تنقید و تحقیق بھی سامنے آ گئی ہے۔ ایک اور اہم بات اس کتاب میں یہ ہے کہ جس شاعر کا بھی ذکر کیا گیا ہے، صرف اس شاعر کی نہیں بلکہ اس کے دور کی بھی زندہ تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

شعرا کے تذکرے میں خاکہ نویسی کا انداز بھی بہت نمایاں ہے جس کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ ہم خود اس دور میں پہنچ گئے ہیں اور اس دور کے مخصوص شعرا سے روبرو ہیں۔ آب حیات میں ہر شاعر کے کلام کے بہت سے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں اور ان پر بڑی حد تک ناقدانہ تبصرہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

آب حیات کے چھپنے کے بعد عموماً والہانہ انداز میں اس کا خیر مقدم کیا گیا اور یہ کتاب ایسی مقبول ہوئی کہ دو تین سال کے اندر اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ لیکن متعدد اہلِ قلم نے اس کتاب پر اعتراض بھی کیے۔ ایسے معترضین میں عبدالحلیم شرر بھی شامل ہیں۔ آب حیات کے پہلے ایڈیشن میں مومن خاں مومن کا ذکر شامل نہیں تھا، یہ لوگوں کا عام اعتراض تھا، لیکن دوسرے ایڈیشن میں یہ کمی پوری کر دی گئی۔ تاہم نظیر اکبرآبادی کے ذکر سے یہ کتاب خالی ہی رہی۔ اس کتاب کے نکتہ چینوں میں حافظ محمود خاں شیرانی اور نیاز فتح پوری کو بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔

آب حیات پر ہر زمانے میں ایک بہت بڑا اعتراض یہ بھی کیا جاتا رہا ہے کہ انھوں نے اپنے استاذ شیخ محمد ابراہیم ذوق سے بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ان کی عقیدت غلو کی حدوں کو پہنچی ہوئی ہے، حتیٰ کہ ان کے مقابلے میں غالب کی حیثیت سے بھی ناانصافی برتی گئی ہے۔

ان تمام باتوں کی روشنی میں یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب تاریخ، تحقیق، تنقید اور سراپا نگاری، ان تمام اعتبارات سے ایک ناقابلِ فراموش اور غیر معمولی کتاب ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کے محرک کے طور پر خود محمد حسین آزاد نے بعض نکات کی وضاحت کی ہے جس کو ان کے ان الفاظ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

> ''نئے تعلیم یافتہ لوگ جن کے دماغوں میں انگریزی لالٹینوں سے روشنی پہنچی ہے، وہ ہمارے تذکروں کے اس نقص پر حرف رکھتے ہیں کہ ان سے کسی شاعر کی زندگی کی سرگزشت کا حال معلوم ہوتا ہے، نہ اس کی طبیعت اور عادات و اطوار کا حال کھلتا ہے، نہ اس کے کلام کی خوبی اور صحت و سقم کی

کیفیت کھلتی ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معاصرین میں اور اس کے کلام میں کن کن باتوں میں کیا نسبت تھی۔ انتہا یہ کہ سال ولادت اور سال وفات تک بھی نہیں کھلتا...... خیالات مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں، انھیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو، اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی، چالتی، پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انھیں حیاتِ جاوداں حاصل ہو۔" (آب حیات)

OOO

نیرنگ خیال

محمد حسین آزاد کی تصانیف میں بہت سے رجحانات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً آبِ حیات اگر ادبی تاریخ و تذکرے کی کتاب ہے تو دربارِ اکبری پوری طرح ایک سماجی اور سیاسی تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظمِ آزاد اگر محمد حسین آزاد کی شعری کاوشوں کا نتیجہ ہے تو دیوانِ ذوق میں ان کی تحقیق و تدوین کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آگئی ہیں۔ اسی طرح نیرنگ خیال ان کے بالکل الگ رجحان کی شہادت دیتی ہے۔ اس کتاب کے بیشتر مضامین تمثیلی نوعیت کے ہیں۔ یعنی تمثیلی نوعیت کے مضامین میں انھوں نے بہت سے مضامین و موضوعات کو، اگر وہ تجریدی بھی ہیں تو ان میں وہ تجسیمی شان پیدا کردی ہے۔ اس لیے کہ تمثیل دراصل مجرد چیزوں کو مجسم اور محسوس شکل میں پیش کرنے کا نام ہے۔

نیرنگ خیال اس اعتبار سے ان کی قدرِ مختلف کتاب ہے جو آبِ حیات کی ہی اشاعت کے آس پاس 1880 میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب اصل میں آزاد کے ان لکچروں کا مجموعہ ہے جو پہلے انجمن پنجاب کے رسالے میں چھپ چکے تھے۔ اس کتاب میں شامل مضامین کو بعض لوگوں نے انشائیوں کا بھی نام دیا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مضامین پوری طرح سے طبع زاد ہیں۔ لیکن بعد کے محققین نے زیادہ تر مضامین کو دیکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے بیشتر انگریزی سے ماخوذ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آزاد نے ان میں اپنا اسلوب بیان اور تخیل شامل کر کے طبع زاد مضامین کی

شان پیدا کردی ہے۔ نیرنگ خیال میں یوں تو چودہ مضامین شامل ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ گلشن امید کی بہار، انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا اور شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربارِ اعلیٰ درجے کے انشائیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں تمثیلی طریقۂ کار کو اپنایا گیا ہے۔ محمد حسین آزاد کا زمانہ چونکہ مغربی ادب کے رجحانات کی تقلید کا زمانہ تھا اس لیے جس طرح جدید نظم کی تحریک اور رومانی ادب کو مغرب کی تقلید میں پنپنے کا موقع ملا اسی طرح تمثیلی انشائیہ نگاری بھی رفتہ رفتہ بڑی مقبول ہوئی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ مضامین ڈاکٹر لائٹز کے ایما پر انگریزی انشائیوں کو بنیاد بنا کر لکھے تھے۔ ان مضامین میں تخیلاتی فضا اور مختلف جذبات و محسوسات کو مجسم تصویری پیکروں میں پیش کرنے کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ اس زمانے میں انگریزی کے انشائیہ نگار جانسن اور ایڈیسن اردو والوں میں بہت مقبول ہو رہے تھے۔ آزاد نے بھی ان کے بعض مضامین کو خوب صورتی کے ساتھ مقامی انداز میں پیش کر دیا ہے۔ ان مضامین کے تصوراتی اور تخیلاتی کردار بھی انسانی یا بعض اور طرح کے جسمانی کرداروں میں نمودار ہوئے ہیں۔ یوں بھی انھوں نے جہاں کہیں انگریزی سے ترجمے کیے ہیں ان میں بھی اپنی تخلیق کی شان پیدا کردی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی اور روزمرہ اور محاورے کی آمیزش سے ان کا اسلوب ایک رواں دواں اور متحرک تصویر میں پیش کرنے کا انداز بھی لیے ہوئے ہے۔ محمد حسین آزاد نے نیرنگ خیال کے مضامین میں جس اسلوب اور انداز میں اپنے مدعا کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اس سے ان کی تحریر کی اثر انگیزی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔

اس کتاب کے انداز تحریر کے نمونے کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، جو ان کے مضمون "سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ" سے ماخوذ ہے:

> "اس وقت دروغ دیوزاد اپنا ہجوم دھام بڑھانے کے لیے سر پر بادل کا دھواں دھار لپیٹ لیتا۔ لاف و گزاف کو حکم دیتا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کردو۔ ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دیتا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں طراری کی تلوار، بائیں ہاتھ میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی۔ غلط نما تیروں کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ دل کی ہٹ دھری، بات کی پیٹھ پیچھے سے زور لگاتے تھے۔"

OOO

سخن دان فارس

یہ بات تو ہم سب لوگوں کو معلوم ہے کہ فارسی زبان و ادب سے محمد حسین آزاد کو غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اسی باعث وسط ایشیا کا ایک سفر کرنے کے باوجود ان کی خواہش تھی کہ وہ ایران کا باقاعدہ سفر کریں، وہاں کے علما اور ادیبوں سے ملاقات کریں، وہاں کی لائبریریوں سے استفادہ کریں اور اہلِ زبان کے لب ولہجہ اور اندازِ تکلم سے بھرپور واقفیت حاصل کریں۔ ایران کا سفر ہر چند کہ انھوں نے قدرے بعد میں کیا مگر اس سے پہلے وہ بہت سے ایسے لکچرز مشرقی ادب پر دے چکے تھے جو فارسی زبان و ادب سے متعلق تھے۔ سخن دان فارس درحقیقت انھی لکچرز کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے ابتدائی دو تین خطبات میں لسانی اعتبار سے فارسی زبان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جبکہ باقی دوسرے لکچرز فارسی ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ویسے تو یہ لکچرز آزاد نے انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں دیے تھے، لیکن بہت دنوں تک انھیں کتابی شکل میں شائع ہونے کا موقع نہیں ملا۔ بالآخر یہ کتاب 1907 میں اس وقت شائع ہوئی جب آزاد ایران کا باقاعدہ سفر کر آئے تھے۔ اسی مناسبت سے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ ایران کے سفر کے بعد محمد حسین آزاد نے اپنے مسودہ میں مزید کچھ باتیں شامل کی تھیں۔ آزاد کے ان خطبات میں ان کا اسلوب بیان بہت نمایاں ہے اور معلومات کی فراوانی نظر آتی ہے — جو

خطبات فارسی لسانیات سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں آزاد نے زبانوں کے ارتقا اور تشکیل سے بھی تفصیلی بحث کی ہے۔ اس ضمن میں ان کا ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

''کسی زبان کی نکتہ فہمی کا حق ادا ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے ملک کی تاریخ اور جغرافیہ اور ملکی حالات اور اہلِ ملک کے عادات و اطوار سے بخوبی واقفیت نہ ہو۔ زبان جن اشعاروں اور تشبیہوں سے مرصع ہوتی ہے ان کی بنیاد ضرور کسی نہ کسی خصوصیت ملکی پر ہوتی ہے۔ انھیں کی بنیاد پر وہ نمکین محاورے اور رنگین استعارے اور چبھتے ہوئے اشارے، کھٹکتے ہوئے کنایے قرار پاتے ہیں جو ان کی انشا پردازی کو دوسری زبانوں کی فصاحت سے الگ جلوے دے کر روشن اور ممتاز دکھاتے ہیں۔''

سخن دان فارس کے وہ لکچرز بھی بہت اہم ہیں جن میں آزاد نے لفظوں کے معانی میں تغیرات اور ان کی مختلف لطافتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس پوری کتاب میں ایران کے جغرافیائی حالات اور سماجی صورت حال کا جگہ جگہ ذکر ملتا ہے کہ ان عناصر نے فارسی زبان و ادب پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں۔ فارسی کی رسمی نثر نگاری پر بہت غیر جانب دارانہ تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ اس طرح کی مقفّیٰ اور مسجّع انشا پردازی اور پُر تکلف عبارت آرائی سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ آزاد نے یہ لکچرز 1872 اور 1874 کے آس پاس دیے تھے جبکہ انھوں نے ایران کا سفر 1880 کے بعد کیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے پہلے حصہ کی جزوی اشاعت 1873 میں عمل میں آئی تھی۔ ایران کے سفر کے بعد باقاعدہ انھوں نے تمام لکچرز پر نظر ثانی کی اور بالآخر جیسا کہ عرض کیا گیا کہ آغا محمد ابراہیم (آزاد کے بیٹے) کے زیر اہتمام 1907 میں مکمل کتاب شائع ہو کر سامنے آئی۔ آزاد کو تقابلی لسانیات سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا ہے:

''مجھے اس طرح کی تحقیقات کا شوق نہیں جنون ہے۔ لڑکپن میں بھی لفظوں کے حروف کو ہیر پھیر اور ادل بدل کر فارسی اور سنسکرت کے لفظوں کو ملایا کرتا

تھا۔ اس زبان میں تھوڑی تھوڑی معلومات پیدا کی۔ بڑی کوشش سے ژند، پہلوی اور دری کی کتابیں جو مل سکیں بہم پہنچائیں۔ انھیں کے لیے بمبئی گیا، پھر ایران تک کا سفر کیا۔ موبدوں اور دستوروں سے ملا۔ ایک برس وہاں رہا لیکن فائدہ بہت کم حاصل ہوا۔''

ایک نقاد اور ماہر لغات کی حیثیت سے وہ عموماً غیر جانب دارانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ امیر خسرو کی مشہور ترین ''اعجاز خسروی'' پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''چھ سو اٹھاسی صفحے کی کتاب ہے مگر اوّل سے آخر تک ایہام، مراعات النظیر، طباق، تضاد وغیرہ وغیرہ۔ صنائع و بدائع میں لغت بازی اور جگت بازی کا......؟ برس رہا ہے۔ اس دھواں دھار میں تاریخی، آگاہی، اخلاقی تاثیر، علمی مسائل، مذہبی ہدایت کچھ نظر نہیں آتی۔ لفظوں ہی لفظوں میں ساری دنیا تمام ہے۔''

سخن دانِ فارس محض معلومات کا ہی خزانہ نہیں ہے بلکہ آزاد کی انشاپردازی کی تخلیقی شان بھی اس میں جلوہ گر ہے۔ اگر اس کتاب کا ایک اقتباس ملاحظہ کیا جائے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں کس طرح کی ڈرامائیت اور متحرک مناظر پیدا کر دکھاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی روزمرہ اور محاورے کا استعمال اپنے عروج پر نظر آتا ہے:

''دفعتاً ہوا بند ہوگئی۔ ابر سا گھر آیا۔ دنیا دھواں دھار ہوگئی پھر سفید غبار سا برستا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو زمین پر، کوٹھوں پر، دیواروں پر اور منڈیروں پر کوئی سفید سفید آٹا سا چھڑک گیا۔ غرض کہ ایک جھکولہ برف کا اور گرا۔ رات گزری، صبح کو دیکھا تمام درختوں پر برگ ریز کا حکم پہنچ گیا۔ دوسرے دن ایک جھکولہ اور ساتھ ہی ایک سراٹا ہوا کا آیا اور پھر جو دیکھا تو درخت پر پتے کا نام نہیں۔ جو درخت پہلے پتے سے بھرے تھے خالی جھاڑیاں کھڑے ہیں۔''

OOO

دربار اکبری

محمد حسین آزاد کو مغلیہ حکمرانوں سے جو خاص لگاؤ تھا اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریری زندگی کے آغاز میں ہی اپنے والد کے اس اخبار میں لکھنا شروع کردیا تھا جو صحیح معنوں میں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کا وفادار اخبار تھا۔ اس اخبار کا نام ہر چند کہ اردو اخبار تھا لیکن کچھ دنوں تک اس کی پیشانی پر اخبار الظفر بھی چھپتا رہا۔ اسی اخبار میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ بھی آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے شائع کروایا تھا۔ اسی عقیدت اور وابستگی کا نتیجہ تھا کہ وہ بہت دنوں تک مغلوں کے عظیم الشان شہنشاہ اکبر پر مبسوط انداز میں کتاب لکھنے کا ارادہ کرتے رہے۔ بالآخر 1880 میں اس کام کی طرف باقاعدہ متوجہ ہوئے، پھر بھی بار بار یہ کام میں تعویق پڑتا گیا۔ پھر بھی ان کے ہوش وحواس کے آخری مراحل تک تکمیل کی کوشش جاری رہی۔ اس کتاب کا نام آزاد نے پہلے سے دربار اکبری سوچ رکھا تھا تاہم خصوصیت کے ساتھ منتخب التواریخ، اکبرنامہ اور آئینۂ اکبری کو اس کے ماخذ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ ماثر الامرا، سوانح اکبری اور خزائن الاسرار سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ انھوں نے منتخب التواریخ سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ حالانکہ اس کتاب میں وہ ملّا بدایونی کی تلخ گفتاری اور شب وستم کے شاکی بھی نظر آتے ہیں۔

اس کتاب سے پہلے جب آزاد نے قصص ہند لکھی تھی اور ہندستانی تاریخ کے درخشاں ابواب سے اپنی دلچسپی ظاہر کی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہندستان کے کسی نمائندہ حکمراں کو اپنا موضوع ضرور بنانے والے ہیں۔ اس طرح دربار اکبری کی تصنیف دراصل ہندوستان کے سب سے سنہرے دور کو نمونہ کے طور پر پیش کرنے کے مترادف ہے، اور کیوں نہ ہو کہ دنیا کی تاریخ میں جس طرح سکندر اعظم کا نام لیا جاتا ہے اسی طرح اکبر کو بھی اکبر اعظم سے موسوم کیا جاتا ہے۔ محمد حسین آزاد کو یہ بات بہت پُرکشش معلوم ہوتی تھی کہ اکبر کے زمانے میں علوم وفنون کو ترقی ملی، عوام کو فراغت وسکون میسر آیا اور سماجی فلاح و بہبود کا کام بھی سب سے زیادہ سامنے آیا پھر یہ کہ اکبر کی مذہبی رواداری، وسیع النظری اور روشن خیالی محمد حسین آزاد کو بہت مثالی معلوم ہوتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اکبر پہلا ہندستانی بادشاہ تھا جس نے اپنی رعایا کو مکمل فکری اور مذہبی آزادی عطا کی۔

دربار اکبری آزاد کی تصنیفات میں تقریباً آٹھ سو صفحے کی سب سے ضخیم کتاب ہے جس میں آزاد کا تاریخی شعور بہت مربوط انداز میں سامنے آیا ہے۔ ہر چند کہ یہ تاریخی کتاب ہے مگر اس میں شہنشاہ اکبر اور ان کے اہم درباریوں کا ذکر اسی لطف کے ساتھ بیان ہوا ہے جس طرح آزاد نے آب حیات میں میر، سودا اور انشاء اللہ خاں انشا کے حالات کیے ہیں۔ یہ کتاب اس بات کی بھی شہادت ہے کہ تاریخ نگاری محض ایک رسمی عمل نہیں ہے، بلکہ تاریخ نویس کہ نقطۂ نظر کے سبب اپنا مخصوص سیاق وسباق پیدا کرسکتی ہے۔ اکبر کے زمانے کی جنگی فتوحات، فن سپہ گری اور درباری شان وشوکت کا بیان بھی آزاد نے بہت مؤثر انداز میں کیا ہے۔ ویسے آزاد اکبر کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی رواداری کا ثبوت دیتے ہیں اور دین الٰہی کی ایجاد کے باوجود وہ اکبر کو عام مسلمانوں کی طرح ملحد نہیں گردانتے۔ اخیر میں دربار اکبری کے ایک اقتباس سے اس کتاب کے انداز بیان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> ''اُسے دیکھا کہ فوجوں کی سیاہ آندھی جو سامنے سے اُٹھی تھی، برابر کو نکل گئی۔
> یکبارگی فوج کو للکار کر حملہ کیا۔ حریف ہاتھیوں کے حلقے میں تھا، اور مجرد بہادر
> افغانوں کا غول تھا۔ اس نے پھر حلقے کو ریلا۔ ترک تیروں کی بوچھار کرتے

ہوئے بڑھے، ادھر سے ہاتھی تلواریں سونڈوں میں پھراتے اور زنجیریں جھکاتے آگے آئے۔ اس وقت علی قلی خاں کے آگے بیرم خاں جانفشانی کر رہے تھے..... کئی فوج اناج کے دانوں کی طرح کھنڈ گئیں پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری۔ ہاتھی پر سوار چاروں طرف پھرتا تھا۔ سرداروں کے نام لے لے کر پکارتا تھا کہ سمیٹ کر پھر جمع کر لے۔ اتنے میں ایک قضا کا تیر اس کی آنکھ میں ایسا لگا کہ باہر نکل گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے تیر کھینچ کر نکالا اور آنکھ پر رومال باندھ لیا مگر زخم سے ایسا بے حواس ہوا کہ ہودہ میں گر پڑا۔ یہ دیکھ کر اس کے ہواخواہوں کے جی چھوٹ گئے۔"

OOO

دیوانِ ذوق

شیخ محمد ابراہیم ذوق محمد حسین آزاد کے معتمد غیر معمولی طور پر محترم استاد تھے۔ آزاد نے ساری عمر ان کو ایک مثالی استاد کی حیثیت دی اور خود استاد بھی ان کو اپنے عزیز ترین شاگردوں میں شمار کرتے تھے۔ اتفاق دیکھیے کہ آزاد کا نام محمد حسین بھی ذوق کا ہی رکھا ہوا تھا۔ اس لیے کہ وہ آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے بہت خاص دوست تھے اور ان سے شب و روز کا ملنا جلنا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ مولوی محمد باقر کی لال قلعہ تک رسائی اور بہادر شاہ ظفر کے حلقۂ بہ گوش ہونے میں بھی ذوق کا یہ وسیلہ معاون رہا ہو۔ جب آزاد اپنے ایام طفولیت میں دتی کالج کے طالب علم تھے تب سے ہی ذوق کی قربت اور رفاقت انھیں حاصل رہی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس وقت سے ہی ذوق کا جو بھی تازہ کلام ہوتا آزاد اسے محفوظ کرلیا کرتے تھے۔ کئی واقعات ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جب بھی استاد ذوق کو اپنا کوئی شعر یاد نہ آتا تو وہ آزاد سے پوچھتے جو آزاد بے تکلف سنا دیا کرتے تھے۔ یہ تاریخی حقیقت بھی آزاد کی ذوق سے غیر معمولی عقیدت کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ 1857 کی افراتفری میں جب مولوی محمد باقر کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا اور آزاد اپنے گھر کے باقی ماندہ لوگوں کے ساتھ دہلی سے بے سر و سامانی کے عالم میں باہر نکلے تو جو چند علمی دستاویز ان کے پاس تھے ان میں سب سے وقیع دیوانِ ذوق تھا،

لیکن یہ عجیب بات ہوئی کہ دہلی سے نکلنے اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں وقت گزارنے اور بالآخر لاہور میں قیام پذیر ہونے کے پورے 25-20 برسوں کے عرصہ میں آزاد کو اتنی ذہنی فراغت کیوں کر حاصل ہو سکتی تھی کہ وہ یکسوئی سے دیوانِ ذوق کی باقاعدہ تدوین میں مصروف ہو جاتے۔ خدا خدا کر کے نوے کی دہائی میں جب وہ پنجاب میں کچھ اطمینان سے وقت گزارنے لگے اور گورنمنٹ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے تو انھوں نے 1885 کے بعد سے 1889 تک اس کام کو سرانجام دیا۔ حالانکہ یہ زمانہ وہ تھا جب ان پر تھوڑے بہت جنون کے دورے پڑنے لگے تھے اور عمر بھی خاص پختہ ہو چکی تھی۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا بھی ہے کہ:

> ''چاہا کہ اب دربار اکبری سنبھالوں مگر مروّت اور حمیت نے اجازت نہ دی کیونکہ استاد مرحوم شیخ محمد ابراہیم ذوق کی تہذیبی غزلیں، قصیدے بے ترتیب ہیں اور یہ میں خوب جانتا ہوں کہ ان کا ترتیب دینے والا میرے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔ اگر میں ان کے باب میں بے پروائی کروں گا تو یہ ان کی محنت کا نتیجہ، جو دریا سے قطرہ رہ گیا ہے، بے موت مر جائے گا اور اس سے زیادہ افسوس کا مقام کیا ہوگا؟ ان کے حال پر افسوس نہیں، یہ میری غیرت اور حمیت پر افسوس ہے۔ چنانچہ اب اس لیے سنبھالا ہے اور اس میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جس جس قصیدے یا غزل یا شعر کے موقع پر کوئی تقریب، کوئی معاملہ یا معرکہ خاص پیش آیا تھا وہ بھی نقل کروں کیونکہ میں ہر وقت کا حاضر باش تھا اور والد مرحوم اور وہ عالم طفولیت میں ساتھ رہے...... آپ اس کے لطف کو تصور فرمائیے۔ آج تک کسی شاعر کا دیوان ایسا مرتب نہ ہوا ہوگا خدا انجام کو پہنچائے۔''

محمد حسین آزاد نے استاد کے نام سے غایت عقیدت میں اپنے بیٹے کا نام بھی محمد ابراہیم رکھا تھا۔ اس دیوان کی تدوین و تحقیق کے دوران ان کی لگن کا یہ عالم تھا کہ ان کو جو ذہنی اختلال کبھی کبھی ہو جاتا تھا اس دوران بڑی حد تک جنون میں بدل گیا۔ تدوین کے زمانے

میں آزاد نے تدوین کے اصولوں کو پیش نظر رکھا، مطبوعہ اور مروجہ دواوین سے اصل کلام کا موازنہ کرتے رہے اور جہاں جہاں ضرورت تھی حواشی لکھنے پر پوری توجہ صرف کی۔ دو تین دہائیوں میں اصل مسودے کے بہت سے حروف کے مٹ جانے اور کاغذ کے بوسیدہ ہو جانے کی وجہ سے مٹے ہوئے حروف کی صحیح قرأت اور نامکمل اشعار کی تحقیق پر پوری توجہ صَرف کی۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ آزاد نے عقیدت کی انتہا یہ کی کہ بعض نامکمل غزلیں خود سے مکمل کر کے اس کی تدوین میں شامل کر دی مگر آج تک کسی نے اس الزام کا قرار واقعی ثبوت پیش نہیں کیا۔ پھر یہ بھی ہے کہ آزاد لاکھ بڑے انشا پرداز رہے ہوں لیکن استاد ذوق کے مرتبہ اور انداز کے شعر کہہ لینا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ ضرور ہے کہ محمد حسین آزاد جیسے محقق و مدون کی ترتیب و تدوین کی بدولت شیخ محمد ابراہیم ذوق کو اپنا صحیح مقام پانے کے معاملے میں سہولت بہم پہنچی۔ آزاد نے اس دیوان کی تکمیل پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس طرح کے الفاظ لکھے:

> ''ہم سے آغاز تھا، شکر یہ انجام ہے کہ فرض نے اپنا حق ادا کیا اور عمروں کی آرزو آج پوری ہوئی۔ قلم کا مسافر زمین سے آسماں اور مکاں سے لامکاں تک بارہا چڑھتا اور اترتا رہا مجھ میں اتنی طاقت کہاں تھی، پاک نیت کا زور تھا اور صدق عقیدت نے پرواز لگائے یہ رتبہ پائے ـــ ایک حساب سے دلّی سے نکل کر 34 برس ہم تم ساتھ رہے۔ پریشانی اور سرگردانی حد سے گزری مگر رفاقتوں میں فرق نہیں آیا۔''

دیوانِ ذوق کے تدوین کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ محمد حسین آزاد نے اس پر بہت طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں کچھ آپ بیتی بھی ہے مگر زیادہ تر خوش گفتاری کے ساتھ استاد کی عقیدت کارفرما نظر آتی ہے۔ لطائف و ظرائف تو ان کی تحریر کا خاصہ ہوا کرتے تھے تاہم انھوں نے تدوین اور حاشیہ نشینی کے کام کو پورے طور ایک محقق کے طور پر انجام دیا ہے۔

OOO

نظم آزاد

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے 'نظم آزاد' محمد حسین آزاد کی ان نظموں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے نظم جدید کی تحریک کے دوران مناظموں میں پڑھ کر سنائے تھے۔ آزاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد ضرور تھے مگر انھوں نے ذوق کے انداز کی غزل گوئی کبھی نہیں کی۔ منہ کا مزہ بدلنے کے لیے ان کے کلام میں بعض غزلیں ضرور مل جاتی ہیں مگر ان غزلوں میں روایتی رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ اس بات کا ذکر پہلے متعدد بار آچکا ہے کہ محمد حسین آزاد نے لاہور میں نئی نظم کی تحریک شروع کی۔ تاہم وہ تحریک باقاعدہ طور پر شروع تو 1874 سے ہوئی تھی مگر اس سے کافی پہلے سے آزاد نے انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے مختلف موضوعات پر لکچر دینا شروع کر دیا تھا۔ ان لکچرز میں ادبی، تاریخی اور لسانی نوعیت کے بہت سے موضوعات زیر بحث آئے تھے۔ ان ہی موضوعات میں سے اردو شاعری بالخصوص روایتی اردو شاعری سے بے اطمینانی ظاہر کرتے ہوئے آزاد نے 1867 میں بھی ایک لکچر دیا تھا جس کا عنوان ''نظم اور کلام موزوں کے بارے میں خیالات'' تھا۔ اس لکچر کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کو ابتدا میں ہی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ انگریزی حاکموں کا شاعری سے متعلق رجحان کیا تھا، اس لیے اگر یہ کہا جائے تو کوئی غلط بات نہ ہوگی کہ آزاد نے 1874 سے تقریباً سات سال قبل کم و بیش اسی نوع کے

تصورات پیش کیے تھے جو بعد میں نئی نظم کی تحریک کے دوران شعوری طور پر اپنائے گئے اور ان کو کرنل ہالرائیڈ کے ایما کے مطابق عام کرنے کی کوشش کی گئی۔ اتفاق سے آزاد نے جب اپنا مجموعہ "نظم آزاد" کے نام سے شائع کیا تو اس کی تمہید یا پیش لفظ کے طور پر اپنے پہلے لکچر کو بھی شامل کر دیا تھا۔ اس سے قبل کہ ہم محمد حسین آزاد کی بعض نظموں کو دیکھیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیش لفظ سے دو اقتباسات پر ایک نگاہ ڈال لیں:

> "اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے، جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گل دستے، ہار، طرّے ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔"

> "فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغے اور بلند پروازیوں کے بازوؤں سے اڑے، قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے، لفاظی اور شرکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہوگئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم، کسی شے پر رغبت یا نفرت، کسی سے خوف یا خطر یا کسی قہر یا غضب، غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو، اس کے بیان سے وہی اثر، وہی جوش سننے والوں کے دلوں میں چھا جاتے جو اصل کے مشاہدے سے ہوتا ہے۔ بے شک مبالغے کا زور، تشبیہ و استعارے کا نمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے، لیکن نمک اتنا ہی چاہیے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام کھانا نمک نمک۔"

محمد حسین آزاد نے یوں تو موضوعاتی نظمیں بعد میں بھی مختلف موقعوں سے لکھیں، لیکن نظم آزاد، صحیح معنوں میں ان کی ان نظموں کا مجموعہ ہے جس کا تصور وہ اپنے ایک سے زیادہ لکچر میں پیش کر چکے تھے۔ آزاد نے یہ تحریک محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر کرنل ہالرائیڈ کے ایما پر شروع کی تھی اس لیے ہالرائیڈ نے ان کے خیالات کی بار بار توثیق بھی کی اور اس نوع کی نظموں کو فروغ دینے کی تلقین بھی کی۔ 1874 میں انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے

محمد حسین آزاد نے جو لکچر دیا تھا وہ صحیح معنوں میں انگریزی میں رائج نظموں کی تقلید کا پیغام تھا اور اس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ اردو میں رائج تشبیہ و استعارہ کی کثرت اور تصوراتی باتوں سے نظم کہنے والوں کو اجتناب برتنا چاہیے۔ اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ آزاد کے زمانے تک اردو میں کلاسیکی غزل کا بول بالا تھا جس میں بعض موضوعات بار بار آیا کرتے تھے۔ بہت سے مضامین تقریباً یکساں تھے اور بہت کم انفرادی رنگ شاعر کے انداز شعرگوئی میں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام رجحانات کی کوئی روایت مغرب میں بالعموم اور انگریزی میں بالخصوص بالکل نہیں تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ نوآبادیاتی فکر کی درآمد کے سبب یہاں کے تمام دیسی رویوں پر شک کی نگاہ ڈالنا بہت ضروری خیال کیا جانے لگا تھا۔ چنانچہ انگریز تو انگریز خود ہندستان بھی بہت بڑی تعداد میں انگریزوں کے افکار و تصورات کی ترجمانی بالکل تقلیدی انداز میں کرنے لگے تھے۔ یورپ میں اٹھارھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک رومانی نظموں کا بول بالا رہا۔ اس لیے آزاد کے زمانے کے سارے انگریز حکمراں اس روایت کے پروردہ تھے اور جہاں وہ اپنی تہذیب، ثقافت، رہن سہن اور مغرب کی بالادستی کا لوہا مشرقی لوگوں سے منوانا چاہتے تھے وہیں زبان اور شعر و ادب میں بھی بعض ایسی تبدیلیوں کے خواہاں تھے جو ان کے ادب اور ان کے لسانی رویوں کو اپنانے کی طرف ہندستانیوں کو مائل کر سکیں۔

اس پورے پس منظر میں جب شاعری کے معاملے میں انگریزی موضوعات، اصناف اور شاعرانہ رجحانات کی بالادستی کا انگریز حکمرانوں کو یقین ہو گیا تو انھوں نے ایسے مشاعروں کا سلسلہ شروع کرایا جن میں محض نظمیں پڑھ کر سنائی جا سکیں۔ اس کے لیے موضوع پہلے سے متعین کر دیا جاتا اور شعرا اپنی اپنی نظمیں لے کر مشاعروں میں آتے اور انھیں سناتے۔ آزاد کی قائم کردہ اس تحریک میں اگر کسی اردو کے بے حد مقتدر شاعر و ادیب نے ان کا ساتھ دیا تو وہ الطاف حسین حالی تھے۔ چنانچہ اس نوع کے تقریباً چار پانچ مشاعروں میں حالی نے اپنی نظموں کے ساتھ شرکت کی۔ یہ وہ آغاز تھا جس نے بیسویں صدی کے اوائل اور اس کے بعد اردو میں بڑے بڑے نظم گو شعرا کے سامنے آنے کی راہ ہموار کی۔ اس لیے مناسب معلوم

ہوتا ہے کہ نمونے کے طور پر آزاد کی اس نظم کا ایک حصہ آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے جو انھوں نے ایک مناظمے میں مشاعرے میں 'شب قدر' کے عنوان سے پیش کی تھی۔ یوں تو آزاد نے نظموں کے مشاعروں میں اولوالعزمی، حب وطن، خواب امن، ابر کرم اور داد و انصاف، جیسی نظمیں بھی پیش کی تھیں مگر یہاں نمونے کے طور پر 'شب قدر' کے نام سے معنون مثنوی کے چند اشعار کو ملاحظہ کرنا مناسب ہوگا:

اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں
دزد سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں

بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکاں میں ہے
اور ہاتھ ڈالا اس کے ہراک اِس وآں میں ہے

اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر
ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر

لے جائے گا غرض کہ جو کچھ ہاتھ آئے گا
دیکھو کمائی کس کی ہے اور کون اڑائے گا

ظاہر ہے کہ نظم کے اس حصے میں ہی کیا آزاد کی بیشتر نظموں میں فنی اعتبار سے کوئی بڑا انوکھا پن نہیں تھا مگر ان کی نظموں اور نظموں سے متعلق خیالات کو اس اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ ان کی بدولت اردو شاعری میں نظم گوئی کے حقیقت پسندانہ اور فن کارانہ رجحان کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس لیے نظریاتی پس منظر کے طور پر محمد حسین آزاد کے دو ایک اقتباسات کا اعادہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے:

''اے میرے اہلِ وطن! مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور، مضمون کا جوش و خروش اور لطائف و صنائع تمھارے بزرگ اتنا دے گئے ہیں کہ تمھاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں

میں گھر کر محبوس ہو گئے ہیں۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں جس میں وصل کا کچھ لطف، بہت سے حسرت و ارمان، اس سے زیادہ ہجر کا رونا، شراب، ساقی، بہار، خزاں، فلک کی شکایت اور اقبال مندوں کی خوشامد ہے......''

''افسوس یہ ہے کہ ان محدود دائروں سے ذرا باہر نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اٹھا سکتے، یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہے تو اس کا بیان بدمزہ ہو جاتا ہے......ان محدود احاطوں میں جو کچھ موجود ہے وہ ڈیڑھ سو برس سے آج تک بڑے بڑے سحر البیان فصیحوں نے شام کو صبح کر کے پیدا کیا ہے۔''

OOO

محمد حسین آزاد کی نمائندہ کتابوں کے منتخب اقتباسات

آب حیات

''بزرگوں کا قول ہے کہ شرافت ونجابت غریبی پر عاشق ہے۔ دولت اور نجابت آپس میں سوکن ہے۔ یہ حق ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ شرافت کے اصول و آئین غریبوں ہی سے خوب نبھتے ہیں۔ امارت آئی قیامت آئی، دولت آئی شامت آئی۔ میاں جرأت کی خوش مزاجی، لطیفہ گوئی، مسخراپن کی حد سے گزری ہوئی تھی، اور ہندوستان کے امیروں نہ اس سے ضروری کوئی کام، نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت ہے۔ کہتے ہیں مرزا قتیل، سید انشا کا اور ان کا یہ حال تھا کہ گھر میں رہنے نہ پاتے تھے۔ آج ایک امیر کے ہاں ہیں، دوسرے دن دوسرے امیر آئے سوار کیا اور ساتھ لے گئے۔ 5-4 دن وہاں رہے۔ کوئی اور نواب آئے۔ وہاں سے وہ لے گئے۔ جہاں جائیں آرام و آسائش سے زیادہ عیش کے سامان موجود۔ رات دن قہقہے اور چہچہے۔ ایک بیگم صاحب نے گھر میں ان کے چٹکلے اور نقلیں سنیں، بہت خوش ہوئیں

اور نواب صاحب سے کہا کہ ہم بھی باتیں سنیں گے۔ گھر میں لا کر کھانا کھلاؤ۔ پردے یا چلمنیں چھٹ گئیں۔ اندر وہ بیٹھیں باہر یہ بیٹھے۔ چند روز کے بعد خاص خاص بیبیوں کا برائے نام پردہ رہا۔ باقی گھر والے سامنے پھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یگانگی کی نوبت ہوئی کہ آپ بھی باتیں کرنے لگیں۔ گھر میں کوئی دادا نانا، کوئی ماموں چچا کہتا۔ شیخ صاحب کی آنکھیں دکھنی آئیں، چند روز ضعف بصر کا بہانہ کر کے ظاہر کیا کہ آنکھیں معذور ہوگئیں۔ مطلب یہ تھا کہ اہلِ حسن کے دیدار سے آنکھیں سکھ پائیں۔ چنانچہ بے تکلف گھروں میں جانے لگے۔ اب پردہ کی ضرورت کیا؟ یہ بھی قاعدہ ہے کہ میاں بیوی جس مہمان کی بہت خاطر کرتے ہیں، نوکر اس سے جلنے لگتے ہیں۔ ایک دن دوپہر کو سو کر اُٹھے۔ شیخ صاحب نے لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے میں پانی بھرلا۔ لونڈی نہ بولی۔ انھوں نے پھر پکارا۔ اس نے کہا کہ بیوی جا ضرور میں لے گئی ہیں۔ ان کے منہ سے نکل گیا کہ عیانی دوانی ہوئی ہے۔ سامنے تو رکھا ہے۔ دیتی کیوں نہیں۔ بیوی دوسرے دالان میں تھیں۔ لونڈی گئی اور کہا کہ وہ بیوی یہ موا کہتا ہے کہ وہ بندہ اندھا ہے۔ یہ تو خاصا سُجھکھا ہے۔ ابھی میرے ساتھ یہ واردات گزری۔ اس وقت یہ راز کھلا۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ آخر آنکھوں کو رو بیٹھے۔

میر تقی میر:

''میر صاحب میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ تھے...... عادات و اطوار نہایت سنجیدہ اور متین اور صلاحیت اور پرہیزگاری نے اسے عظمت دی تھی۔ ساتھ اس کے قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اطاعت تو درکنار نوکری کے نام کی بھی برداشت نہ رکھتے تھے۔ لیکن زمانہ جس کی حکومت سے کوئی سر نہیں اُکسا سکتا اس کا قانون بالکل اس کے

برخلاف ہے۔ نتیجہ یہ کہ فاقے کرتے تھے، دکھ بھرتے تھے اور اپنی بددماغی کے سایہ میں دنیا و اہلِ دنیا سے بیزار گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ ان شکایتوں کے جو لوگوں میں چرچے تھے وہ خود بھی اس سے واقف تھے...... باوجود اس کے اپنے سرمایۂ فصاحت کو دولت لازوال سمجھ کر امیر غریب کسی کی پروا نہ کرتے تھے، بلکہ فقر کو دین کی نعمت تصور کرتے تھے، اور اسی عالم میں معرفت الٰہی پر دل لگاتے تھے۔ چنانچہ ان کی اس ثابت قدمی کا وصف کسی زبان سے نہیں ادا ہوسکتا کہ اپنی بے نیازی اور بے پروائی کے ساتھ دنیائے فانی کی مصیبتیں جھیلیں اور جو اپنی آن تان تھی اسے لیے دنیا سے چلے گئے، اور جس گردن کو خدا نے بلند پیدا کیا تھا۔ سیدھا خدا کے ہاں لے گئے۔ چند روزہ عیش کے لالچ سے یا مفلس کے دکھ سے اسے دنیا کے نااہلوں کے سامنے ہرگز نہ جھکایا۔ ان کا کلام کہے دیتا ہے کہ دل کی کلی اور تیوری کی گرہ کبھی کھلی نہیں۔ باوجود اس کے اپنے ملک خیال کے ایک بلند نظر بادشاہ تھے، اور جتنی دنیا کی سختی زیادہ ہوتی، اسی قدر بلند نظری کا دماغ زیادہ بلند ہوتا تھا...... جو اشخاص اس زمانہ میں قدر دانی کے خزانچی تھے ان کے خیالات عالی اور حوصلے بڑے تھے۔ اس لیے یہ بے دماغیاں ان کے جوہر کمال پر زیور معلوم ہوتی تھیں۔

"ایک دن نواب (سعادت علی خاں) نے روزہ رکھا اور حکم دیا کہ کوئی آنے نہ پائے۔ سید انشا کو ضروری کام تھا، یہ پہنچے۔ پہرہ دار نے کہا کہ آج حکم نہیں آگے آپ مالک ہیں۔ باوجود انتہائی مرحمت کے یہ بھی مزاج سے ہوشیار رہتے تھے، تھوڑی دیر تامل کیا۔ آخر کمر کھول دستار سر سے بڑھا قبا اُتار ڈالی اور دوپٹہ عورتوں کی طرح سے اوڑھ کر ایک ناز و انداز کے ساتھ سامنے جا کھڑے ہوئے۔ جوں ہی اس کی نظر پڑی آپ انگلی ناک پر دھر کے بولے:

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مرے پیارے روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

نواب بے اختیار ہنس پڑے۔ جو کچھ کہنا سننا تھا وہ کہا اور ہنستے کھیلتے چلے آئے۔"

انشاءاللہ خاں انشا:

"میاں رنگین بیان کرتے ہیں کہ میں سوداگری کے لیے گھوڑے لے کر لکھنؤ گیا، اور سرا میں اُترا۔ شام ہوئی تو معلوم ہوا کہ قریب ہی مشاعرہ ہوتا ہے۔ کھانا کھا کر میں بھی جلسہ میں پہنچا۔ ابھی دو تین سو آدمی آئے تھے۔ لوگ بیٹھے باتیں کرتے تھے۔ حقے پی رہے تھے۔ میں بھی بیٹھا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے، سر پر ایک میلا سا پھینٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں پکیوں کا توبڑا ڈالے، ایک گکڑ کا حقہ ہاتھ میں لیے آیا اور سلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا۔ کسی کسی نے اس سے مزاج پُرسی بھی کی۔ اس نے اپنے توبڑے میں ہاتھ ڈال کر تمبا کو نکالا اور اپنی چلم پر سلفا جما کر کہا کہ بھئی ذرا سی آگ ہو تو اس پر رکھ دینا۔ اسی وقت آوازیں بلند ہوئیں اور گڑگڑی، سٹک، پیچوان سے لوگ تواضع کرنے لگے۔ وہ بے دماغ ہو کر بولا کہ صاحب! ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو۔ نہیں تو ہم جاتے ہیں۔ سب نے اس کی بات کے لیے تسلیم اور تعمیل کی۔ دم بھر کے بعد پھر بولا کہ کیوں صاحب ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا؟ لوگوں نے کہا جناب لوگ جمع ہوتے جاتے ہیں۔ سب صاحب آجائیں تو شروع ہو۔ وہ بولا کہ صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھ دیتے ہیں! یہ کہہ کر توبڑے میں سے ایک کاغذ نکالا اور غزل پڑھنی شروع کر دی:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں
بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یک بار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

وہ تو غزل پڑھ، کاغذ پھینک، سلام علیکم کہہ کر چلے گئے مگر زمین و آسمان میں سناٹا ہوگیا، اور دیر تک دلوں پر ایک عالم رہا جس کی کیفیت بیان نہیں ہوسکتی۔"

ooo

نیرنگ خیال

وقت:

"ایک پیر کہن سال کی تصویر ہے۔ اس کے بازوؤں میں پریوں کی طرح پر پرواز لگے ہیں کہ گویا ہوا میں اڑتا چلا جاتا ہے۔ ایک ہاتھ میں شیشۂ ساعت ہے کہ جس سے اہلِ عالم کو اپنے گزرنے کا اندازہ دکھاتا جاتا ہے اور ایک میں درانتی ہے کہ لوگوں کی کشت امید یا رشتۂ عمر کو کاٹتا جاتا ہے یا ظالم خوں ریز ہے کہ اپنے گزرنے میں ذرا رحم نہیں کرتا۔ اس کے سر پر ایک چوٹی بھی رکھی ہے کہ جو دانا ہیں اُسے پکڑ کر قابو میں کر لیتے ہیں لیکن اور دل کی چوٹیاں پیچھے ہوتی ہیں اس کی چوٹی آگے رکھی ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ جو وقت گزر گیا وہ قابو میں نہیں آسکتا۔ ہاں جو پیش بین ہو وہ پہلے ہی سے روک لے سو روک لے۔"

غصہ:

"ایک عورت ہے۔ کالا رنگ ڈراؤنی صورت۔ تمام بدن پر بال کھڑے ہیں جیسے لوہے کی سلائیں۔ سر پر اور بازوؤں پر ہزاروں سانپ پھن اٹھائے لہرا رہے ہیں اور آنکھوں سے خون برستا ہے۔

بعض صورتوں میں اس کے دو پر ہیں کہ اڑائے لیے جاتے ہیں اور اس کے ہاتھ میں شعلہ آتش ہے کہ دمبدم بھڑکتا چلا جاتا ہے اور ایک ہاتھ میں خوں ریزی کا برچھا ہے۔"

عشق:

"ایک موقع پر اسے نوجوان۔ خوب صورت لڑکا فرض کیا ہے کہ خوش ہے اور اپنے عالم میں اچھلتا کودتا ہے مگر آنکھوں سے اندھا رکھا ہے اس میں نکتہ یہ ہے کہ بھلائی برائی کو نہیں سوچتا۔

کبھی ایک جوان آدمی بنایا ہے اور ہاتھ میں چڑھی ہوئی کمان میں تیر جڑا ہوا ہے کہ جدھر چاہتا ہے مار بیٹھتا ہے اس کی پناہ نہیں۔

ایک موقع پر ایسی تصویر کھینچی ہے کہ پہلو میں تیروں کا ترکش لٹکتا ہے اور ہاتھ سے تیر کا پیکاں سان پر تیز کر رہا ہے۔

یہ تصویر ایک ہیرے پر کھدی ہوئی ہاتھ آئی تھی۔ خدا جانے کس عہد میں کھدی ہوگی اور کیا طلسم اس میں باندھا ہوگا۔"

افواہ یا شہرت:

"اس کی تصویر دیکھی، ایک بڑھیا عورت ہے کہ اس کے تمام بدن پر زبانیں ہی زبانیں ہیں۔ پہلے اس کے منہ میں زبان ہلتی ہے ساتھ ہی ساتھ ساری زبانیں سانپوں کی طرح لہرانے لگتی ہے۔ اشارہ یہ ہے کہ جو بات اس کی زبان سے نکلتی ہے وہی عالم میں ایک ایک کی زبان پر آتی ہے۔"

حسن کی پری:

"سمندر کے کف سے پیدا ہوئی ہے۔ شاید اس سے جوش وخروش کے ساتھ

اس کی لطافت اور نزاکت کا بھی اشارہ ہو۔ وہ خود بھی محبت رکھتی ہے مگر لڑائی کے دیوتا پر عاشق ہے جس کو وہ نصیب ہوجائے وہ اس کے پرتو جمال سے کامیاب ہو پھولوں میں مہدی، گلاب، سیب، لالہ، نافرمان وغیرہ سے اس کی درگاہ میں نذر چڑھتی ہے۔ فاختہ، ہنس، ابابیل، ہدہد وغیرہ اس کے تخت کو اڑاتے ہیں۔ خوشبوؤں کی دھونی اور پھولوں کے ہار اس کا متبرک چڑھاوا ہے۔ انگریزی میں انھیں گاڈز کہتے ہیں، اور ہر ایک جذبۂ انسانی بلکہ خزاں اور بہار اور موسیقی وغیرہ کے لیے مختلف گاڈز تیار کیے ہیں۔ زمانے کی گردشوں نے ہمارے علوم کو مٹادیا اس لیے آج یہ باتیں نئی معلوم ہوتی ہیں ورنہ سنسکرت میں بھی اکثر اشیا کے لیے ایک ایک دیوی یا دیوتا ہے۔

مسلمانوں کے دماغ بھی اس خیال سے خالی نہیں تھے۔ ان کی تصنیفات میں فلاسفہ کا قول منقول ہے کہ اگر ایک مور کے پر کو دیکھیں اور اس کے صنائع بدائع پر نظر کریں تو عقل حیران ہوتی ہے کہ کون سا صانع ہوگا جو ایسی دست کاری کرسکے پھر مور کے تمام جسم کو دیکھو اور اسی نسبت سے تمام عالم موجودات اور اس کے جزئیات کو دیکھو، پھر جب دیکھتے ہیں کہ الواحد لا یصدر عنه الا الواحد یعنی ایک فاعل سے ایک وقت میں ایک ہی کام ہوسکتا ہے تو ضرور ہے کہ کائنات کے مختلف کارخانوں کے لیے ایک ایک رب النوع فرض کیا جائے جو اپنے اپنے کارخانے کا سربراہ ہو اور سب کا مالک رب الارباب جامع جمیع صفات کمال اہل شریعت نے اسی کو ہر ایک سلسلہ کا ایک ایک فرشتہ موکل مانا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فقط زبان کا فرق ہے، ورنہ وہی دیوی یا دیوتا، وہی گاڈز، وہی رب النوع وہی فرشتہ موکل یہ خیال مدت سے دل میں کھٹکتا تھا۔ چندروز ہوئے کہ شاہ ایران نے جو سفرنامہ یورپ کا آپ نے لکھا ہے وہ میری نظر سے گزرا۔ فرانس کے معنی آفرینوں نے ایک جگہ باغ رنگین میں ایک نقلی پہاڑ بنایا ہے اور اس پر بہار کی گاڈس

سجائی ہے۔ چنانچہ شاہ نے وہاں پہنچ کر اسے دیکھا ہے اور اپنے بیان میں اسے رب النوع ہی لکھا ہے۔

غرض یہ ہے کہ خیالات کے اتفاقوں کو غور سے دیکھو کہ فقط طبیعت کی تاثیر ہے جس نے مختلف ملکوں میں مختلف طور پر طبیعتوں کے جوش ظاہر کیے ہیں مگر سب کا راستہ کسی قدر قریب قریب ہو کر نکلا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ جب ایک جذبۂ موہوم کو مجسم فرض کرتے ہیں اور اس کی صفات اور لوازمات کو آنکھوں کے سامنے سجاتے ہیں تو اس پر طبیعت کی تاثیر پوری پوری قائم ہوتی ہے اور جو خیالات اس پر نکلتے ہیں ٹھیک درستی کے ساتھ ہوتے ہیں اور برجستہ الفاظ میں ادا ہوتے ہیں کہ یہی انشا پردازی کا ایمان ہے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارے انداز پرانے اور مستعمل ہو گئے تو ہمیں چاہیے کہ انگریزی باغ میں سے نئے پودے لے کر اپنا گلزار سجائیں، البتہ دونوں زبانوں میں ایسی مہارت ہونی چاہیے کہ یہ تصرف خوب صورتی کے ساتھ ہو سکے جیسا کہ ابتدا میں ہماری اردو فارسی کے انشا پرداز کر گئے اور پھر کہتا ہوں کہ یہ مطلب جب کبھی ہوگا ان انگریزی دانوں سے ہوگا جو دونوں زبانوں میں مہارت رکھتے ہوں گے کیونکہ ان کی دو آنکھیں روشن ہیں۔ اردو اپنی زبان ہے اور انگریزی کنجی خدا نے دی۔ ہم اور ہمارے ساتھی پرانی لکیروں کے فقیر۔ جو کچھ کرنا تھا سو کر چکے، نہ ان میدانوں میں اب ہم سے کچھ ہو سکے۔ چقماق کے دونوں جزوں کو ٹکراؤ کہ آگ نکلے۔ اون اور شیشے کو رگڑو کہ الیکٹریسٹی کے فوائد حاصل ہوں، لیکن فقط پتھر ہو تو پتھر ہی ہے، اور فقط شیشہ ڈر کا گھر۔ اپنی زبان کے زور سے اس میں اس طرح جان ڈالو کہ ہندستانی کہیں سودا اور میر کے زمانہ نے عمر دوبارہ پائی اس پر انگریزی روغن چڑھا کر ایسا خوش رنگ کرو کہ انگریزی کہیں ہندوستان میں شیکسپیئر کی روح نے ظہور کیا۔

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا:

(یہ انشائیہ ہے)

''سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہلِ دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جولوگ آپ اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔

میں دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان افلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہلِ عالم اپنے اپنے رنج و الم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چنانچہ اس مطلب کے لیے ایک میدان کہ میدان خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا۔ تجویز ہوا اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے، لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اور بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا۔

ایک شخص سوکھا سہا، دبلاپے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا۔ اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھرتی سے پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بڑی معلوم ہوتی لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا۔ جس کا دامن دامن قیامت سے بندھا

ہوا تھا۔ اس پر دیوزادوں اور جناتوں کی تصویریں زردوزی کڑھی ہوئی تھیں، اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں تو ہزاروں عجیب وغریب صورتیں اس پر نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھ وحشیانہ تھی مگر نگاہ میں افسردگی تھی اور نام اس کا داہم تھا۔ ہر شخص کو بوجھ بندھواتا تھا اور لدواتا تھا اور مقام مقررہ پر لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جنسوں اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھوں کے نیچے گڑگڑاتا دیکھا اور ان مصیبتوں کے انبار کو خیال کیا تو بہت گھبرایا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں ہوسکتا۔

اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اس نے ذرا میرا دل بہلایا۔ صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص پرانے سے چکن کے چغہ میں ایک بھاری سی گٹھری لیے آتا ہے جب وہ گٹھری انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا۔ بدن سے پسینہ بہتا تھا اور مارے بوجھ کے ہانپا جاتا تھا۔ اس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا اور معلوم ہوا کہ اس کی جورو بہت بری تھی۔ اس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔

ان کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سروں پر دودآہ کی گٹھریاں تھیں کہ انہی میں آہوں کے تیر خیالی اور دلوں کے نیزہ دبالی دبے ہوئے تھے۔ اگر چہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے ان کے پھٹ جائیں گے لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہوسکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں۔ کچھ جد وجہد سے سر ہلایا مگر جس طرح لدے ہوئے آئے تھے اسی طرح چلے گئے۔ بہت بڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جھریاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت کچھ موٹے موٹے ہونٹ۔ اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے کہ جنھیں دیکھ کر

شرم آتی تھی۔ مگر مجھے یہ ہی حیرت تھی کہ اس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی عیب تھے۔ ایک شخص کو دیکھتا ہوں کہ اس کی پیٹھ پر بھاری سے بھاری اور بڑے سے بڑا بوجھ ہے مگر خوشی خوشی اٹھائے چلا آتا ہے جب پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک کبڑا ہے اور آدم زاد کے انبار رنج والم میں اپنے کبڑے پن کو پھینکنے آیا ہے کہ اس کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی مصیبت نہیں۔ اس انبار میں انواع واقسام کے سقم وامراض بھی تھے جن میں بعض اصلی تھے اور بعض ایسے تھے کہ غلط فہموں نے خواہ مخواہ انھیں مرض سمجھ لیا تھا۔ ایک بوجھ مجھے اور نظر آیا۔ جو امراض آدم زاد پر عارض ہوتے ہیں ان سب کا مجموعہ تھا یعنی بہت سے حسین نوجوان تھے کہ اپنے ہاتھوں کی کمائی یعنی امراض نوجوانی ہاتھوں میں لیے آئے تھے مگر میں فقط ایک ہی بات میں حیران تھا اور وہ یہ تھی کہ اتنے بڑے انبار میں کوئی بے وقوفی یا بد اطواری پڑی ہوئی نہ دکھائی دی۔ میں یہ تماشے دیکھتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ اگر ہوس ہائے نفسانی اور ضعف جسمانی اور عیوب عقل سے کوئی نجات پانی چاہے تو اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آئے گا۔ کاش کہ جلد آئے اور پھینک جائے۔ اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے بے پروا چلا آتا ہے اس نے ایک گٹھری پھینک دی مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک دیا۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شہدے آئے۔ میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم وحیا کو پھینک گئے۔

جب تمام بنی آدم اپنے بوجھوں کا وبال سر سے اتار چکے تو میاں وہم جو جب سے اب تک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے مجھے الگ کھڑا دیکھ کر سمجھے کہ یہ شخص خالی ہے چنانچہ اس خیال سے میری طرف جھکے۔ ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میرے حواس اڑ گئے، مگر انھوں نے جھٹ اپنا آئینہ سامنے کیا۔

مجھے اپنا منہ اس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ بے اختیار چونک پڑا۔ برخلاف اس کے بدن اور قد وقامت ایسا چوڑا چکلا نظر آیا کہ جی بیزار ہوگیا اور ایسا گھبرایا کہ چہرے کو نقاب کی طرح اتار کر پھینک دیا اور خاص خوش نصیبی اس بات کو سمجھا کہ ایک شخص نے اپنے چہرے کو بڑا اور اپنے بدن پر ناموزوں سمجھ کر اتار پھینکا تھا۔ یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا۔ یہاں تک کہ فقط اس کی ناک میرے سارے چہرے کے برابر تھی۔

ہم اس انبوہِ پُر آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالم ہیولانی کی ایک ایک بات کو تاک کر دیکھ رہے تھے جو سلطان الافلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا کہ اب سب کو اختیار ہے، جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج و تکلیف تبدیل کرلیں، اور اپنے اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں۔ یہ سنتے ہی میاں وہم پھر مستعد ہوئے اور پھر بڑی ترت پھرت کے ساتھ اس انبارِ عظیم کے بوجھ باندھ کر تقسیم کرنے لگے۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ سنبھالنے لگا اور اس طرح کی ریل پیل اور دھکم دھکا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں۔

ایک پیر مرد کہ نہایت معزز و محترم معلوم ہوتا تھا درد قولنج سے جاں بہ لب تھا، لاولدی کے سبب سے اپنے مال واملاک کے لیے ایک وارث چاہتا تھا۔ اس نے دردِ مذکور کو پھینک کر ایک خوب صورت نوجوان لڑکے کو لیا۔ مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہو کر اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بڈھے کی داڑھی پکڑلی اور سرتوڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ درد قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا چنانچہ بڈھے نے اس سے کہا برائے خدا میرا درد قولنج مجھے پھیر دیجیے اور اپنا لڑکا لیجیے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ مبادلہ اب پھر نہ سکتا تھا۔

ایک بے چارا جہازی غلام تھا کہ اس نے قید زنجیر اور جہازی محنت کی تکلیف سے دق ہو کر اس عذاب کو چھوڑا تھا اور جھولے کے مرض کو لے لیا تھا۔ اسے دیکھا کہ دوقدم چل کر بیٹھ گیا ہے اور سر پکڑے بسور رہا ہے۔ غرض اسی طرح کئی شخص تھے کہ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے اور اپنے اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے مثلاً کسی بیمار نے افلاس لے لیا تھا وہ اس سے ناراض تھا۔ کسی کو بھوک نہ لگتی تھی۔ وہ اب جوع البقر کے مارے پیٹ کو پیٹ رہا تھا۔ ایک شخص نے فکر سے دق ہو کر اسے چھوڑا تھا اب وہ دردِ جگر کا مارا لوٹ رہا تھا اور اسی طرح بر عکس۔ غرض ہر شخص کو دیکھ کر عبرت اور پشیمانی ہی حاصل ہوتی تھی۔

عورتیں بے چاری اپنے ادل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا تھا۔ مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ لنگڑاتی تھی اور ہائے ہائے کرتی چلی جاتی تھی۔ کسی کی کمر پہلے بہت پتلی تھی۔ مگر چونکہ سینہ اور بازو بھی دبلے تھے اس لیے پتلی کمر کو چھوڑا تھا۔ اب گول گول بازوؤں کے ساتھ بڑی سی توند نکالے چلی جاتی تھی۔ کسی نے چہرے کی خوب صورتی لے لی تھی مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا زہر اور بدنامی کا ٹیکہ بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہو رہا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں وہ حقیقت میں ہمارے سہارے کے بہ موجب ہوتی ہیں۔ یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے۔

مجھے اس بڈھے کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ ایک خوب صورت سجیلا جوان بن کر چلا۔ مگر مثانہ میں ایک پتھری ہو گئی کہ اب بھی سیدھی طرح نہ چل سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اس نوجوان کے حال پر افسوس آتا تھا کہ بے چارا

لکڑی ٹیکتا، گرتا پڑتا چلا جاتا تھا۔ کمر جھکی ہوئی، گردن بیٹھی ہوئی تھی۔ کھوے سر سے اونچے نکل آئے تھے اور جو عورتیں پہلے اس کی سج دھج پر جان دیتی تھیں ان کا غول گرد تھا یہ انھیں دیکھتا تھا اور پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ جب سب کے مبادلے بیان کیے ہیں تو اپنے مبادلے سے بھی مجھے صاف نہ گزرنا چاہیے۔ چنانچہ اس کی صورت حال یہ ہے کہ بڑے چہرے والے یار میرے چھوٹے چہرے کو لے کر ایسے بدنما معلوم ہونے لگے کہ جب میں نے ان کی طرف دیکھا تو اگرچہ میرا ہی چہرہ تھا مگر میں ایسا بے اختیار ہنسا کہ میری اپنی بھی صورت بگڑ گئی اور صاف معلوم ہوا کہ وہ بے چارا میرے ہنسنے سے شرما گیا۔ مگر مجھے بھی اپنے حال پر کچھ فخر کی جگہ نہ تھی کیونکہ جب میں اپنی پیشانی سے عرق ندامت پوچھنے لگا تو وہاں تک ہاتھ نہ پہنچ سکا۔ چہرہ اتنا بڑا ہوگیا تھا کہ ہاتھ رکھتا کہیں تھا اور جا پڑتا کہیں تھا اور ناک اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ جب چہرے پر ہاتھ پھیرا تو کئی دفعہ ہاتھ نے ناک سے ٹکر کھائی۔ میرے پاس ہی دو آدمی اور بھی تھے کہ جن کے حال پر تمسخر کرنا واجب تھا۔ ایک وہ شخص تھا کہ پہلے ٹانگوں کے مٹاپے کے سبب سے چھدرا کر چلتا تھا۔ اس نے ایک لمٹنگو سے مبادلہ کرلیا تھا کہ جس میں پنڈلی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ان دونوں کو جو دیکھتا تھا وہ ہنستا تھا۔ ایک تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا دو بلیوں پر چلا جاتا ہے۔ سرکا یہ عالم تھا گویا ہوا میں اڑا جاتا ہے اور دوسرے کا یہ حال تھا کہ دونوں طرف دو دائرے کھنچے چلے جاتے تھے۔ میں نے اس عجیب الخلقت کی حالت غریب کو دیکھ کر کہا کہ میاں اگر دس قدم سیدھے چلے جاؤ تو موادمڑی کی ریوڑیاں کھلاتے ہیں۔

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہوگیا مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا یعنی جان سے بیزار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ وزاری۔ نالہ و

فریاد آہ و افسوس سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطان الافلاک کو بیکس آدم زاد کے حال دردناک پر پھر رحم آیا اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اتار کر پھینک دیں۔ پہلے ہی بوجھ انھیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی ان وبالوں کو سر و گردن سے اتار کر پھینک دیا۔ اتنے میں دوسرا حکم آیا کہ وہم جس نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا وہ شیطان نابکار یہاں سے دفع ہو جائے اس کی جگہ ایک فرشتہ رحمت آسمان سے نازل ہوا۔ اس کی حرکات و سکنات نہایت معقول و باوقار تھیں اور چہرہ بھی سنجیدہ اور خوش نما تھا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا اور رحمت الٰہی پر توکل کر کے نگاہ کو اسی کی آس پر لگا دیا۔ اس کا نام صبر و تحمل تھا۔ ابھی وہ اس کوہ مصیبت کے پاس آ کر بیٹھا ہی تھا جو کوہ مذکور خود بخود سمٹنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے ایک ثلث رہ گیا۔ پھر اس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی بوجھ اٹھا اٹھا کر دینا شروع کیا اور ایک ایک کو سمجھاتا گیا کہ نہ گھبراؤ اور بردباری کے ساتھ اٹھاؤ۔ ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی و رضامند چلا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اس کا شکر یہ ادا کرتا تھا کہ آپ کی عنایت سے مجھے اس انبار لا انتہا میں سے اپنا بار مصیبت چننا نہ پڑا۔

OOO

سخن دان فارس

زمستاں:

''دفعتاً ہوا بند ہوئی۔ ابر سا گھر آیا۔ دنیا دھواں دھار ہوگئی۔ پھر سفید غبار سا برستا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو زمین پر، کوٹھوں پر، دیواروں اور منڈیروں پر کوئی سفید آٹا سا چھڑک گیا۔ غرض کہ ایک جھکولا برف کا اور پڑا۔ رات گزری۔ صبح کو دیکھا تو تمام درختوں پر برگ ریز کا حکم پہنچ گیا۔ دوسرے دن ایک جھکولا اور۔ اور ساتھ ہی ایک سناٹا ہوا کا آیا۔ پھر جو دیکھا تو درخت پر پتے کا نام نہیں۔ جو درخت ہفتہ بھر پہلے پتوں سے بھرے تھے اب خالی جھاڑیاں کھڑے ہیں جیسے کسی نے کپڑے اتار لیے۔ وہ بھی سیاہ رنگ جیسے بجلی مارا لوہا۔ ایک دو دن بعد برف برسنی شروع ہوئی مگر کس طرح؟ جیسے کوئی آسمان پر بیٹھا روئی دُھنک رہا ہے۔ ایک دن رات جو برف کا تار لگا تو درو دیوار، زمین آسمان تمام سفید۔ وہ سیاہ جھاڑیاں برف جم کر بلور کے درخت اور شیشہ کی شاخیں ہوگئیں۔''

''پہاڑوں پر برف کے پہاڑ چڑھ گئے۔ جنگلوں میں برف سے رستے رُک

گئے۔ سوداگر جہاں کے تہاں بیٹھ رہے۔ میدان، کھیت، گلی، کوچہ میں گھر گھر قدآدم برفیں چڑھ گئیں۔ بازاروں میں سناٹا، کارخانے بند، غریب کاریگروں کے کاروباران کے ہاتھوں سے بھی سوا ٹھنڈے۔ کوٹھوں پر برف کے انبار ہیں۔ جلدی گراؤ نہیں تو گھر بیٹھا۔ اُمرا کے غلام، نوکر، مزدور، لکڑی کے بیچ شاخے اور پھاوڑیاں لیے ہیں برف گرا رہے ہیں۔ غریب غربا اپنا کام آپ ہی کرتے ہیں۔ پھر گھروں میں آگھستے ہیں۔ آگ بغیر گزارہ نہیں۔ انگیٹھی بیچ میں بیٹھے ہیں۔ جن کو خدا نے دیا ہے ان کے ہاں آتش دان اور بخاریاں روشن ہوتی ہیں۔ کمروں کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ وہ گھروں میں دنبے کاٹتے ہیں، مرغ ذبح کرتے ہیں۔ نہیں تو گوشت قاق کے پلاؤ دم دیتے ہیں۔ اس کی یخنیاں پیتے ہیں۔ کلے پائے اور شب دیگیں پکاپکا کر کھاتے ہیں، اور چائیں اڑاتے ہیں۔ لیکن باہر تمام عالم ویرانہ ہے۔ کھیت اور باغ سب سنسان۔ گیدڑ، لومڑی، خرگوش بلکہ چوہا تک جنگل میں نظر نہیں آتا۔ اپنے اپنے بھٹوں اور بلوں میں گھس رہتے ہیں۔"

"آگ ایسے موقع پر باعث آرام نہیں بلکہ چشمہ بہت سے منافع کا ہوتی ہے، نہیں نہیں۔ اکثر موقع پر باعث زندگی ہوجاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انشائے فارسی نے اس سے بیسیوں لفظ ترکیب دیے ہیں جن سے تیزی، چستی، رونق، قدرومرتبہ وغیرہ کے خیالات روشن ہوتے ہیں۔ مثلاً آتش زبان، آتش بیان، سرخ لباس، آتش سخن (تیز کلام آدمی)، آتش مزاج (تیز مزاج)، آتش کر (چالاک)، آتش لباس، آتش وآب، آتش آب پرور، آتش مجسم (تلوار)، آتش پر آب، آتش بے باد، آتش تو بہ سوز، آتش سرد (شراب) آتش بے دود (سورج، شراب یا غصہ)، آتش پیکر، آتش زمزم، آتش بید (سورج)، آتش ہندی (تیغ ہندی) وغیرہ وغیرہ بیسیوں لفظ ہیں کہ خوبیِ معنی سے مختلف کاموں اور مختلف چیزوں میں رونق اور خوبی پیدا کرتے ہیں۔

برخلاف اس کے سردی سے لوگوں کے کاروبار رُک جاتے ہیں۔ فوائد میں نقصان آتے ہیں۔ پھرتے، چلتے، بیٹھتے، اُٹھتے تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جن الفاظ سے سردی ترکیب پاتی ہے معنوں میں بھی کمی، بے لطفی اور خرابی پیدا کرتی ہے۔ مثلاً وعدۂ سرد، گریۂ سرد، آہ سرد، نازِ خنک، نوائے خنک، گفتارِ خنک، سرد شدن اختلاط (کمی محبت)، سرد حرف، سرد بیان، سرد گوئے، سرد مہر، سرد نفس، سرد رو، خنک طبع، خنک ادا، خنک گفتار، خنک روئے وغیرہ وغیرہ بہت سے الفاظ ہیں۔"

OOO

دربار اکبری

ولادت:

''لیکن حضرت عشق نے شادی کی تھی اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھایا تھا۔ ہمایوں کو دم بھر جدائی گوارا نہ تھی۔ دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا۔ ابھی پنجاب میں ہے، ابھی سندھ میں ہے، ابھی بیکانیر، جیسلمیر کے ریگستان میں سرگرداں چلا جاتا ہے۔ پانی ڈھونڈھتا ہے تو منزلوں تک میسر نہیں۔ جودھ پور کا رخ ہے کہ ادھر سے امید کی آواز آئی ہے قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امید نہ تھا دغا آواز بدل کر بولی تھی۔ وہاں تو موت منہ کھولے بیٹھی ہے۔ ناچار پھر اُلٹے پاؤں پھر آتا ہے۔ یہ سب مصیبتیں ہیں مگر پیاری بی. بی دم کے ساتھ ہے۔ کئی لڑائی کے مقاموں میں اس کے سبب سے خطرناک خرابیاں اٹھانی پڑیں۔ مگر اسے تعویذ کی طرح گلے سے لگائے پھرا۔ جب وہ جودھ پور کے سفر میں تھے تو اکبر ماں کے پیٹ میں باپ کے رنج و راحت کا شریک تھا۔ اس سفر سے پھرے اور سندھ کی طرف آئے۔ ایامِ ولادت بہت نزدیک تھے۔ اس لیے بیگم کو امرکوٹ میں چھوڑا، اور آپ آگے

پرانی لڑائی کو تازہ کیا۔ اس عالم میں ایک دن ملازم آ خرخبر دی کہ مبارک: اقبال کا تارا طلوع ہوا۔ یہ ستارا ایسے ادبار کے وقت جھلملایا تھا کہ کسی کی آنکھ اُدھر نہ اُٹھی۔ مگر تقدیر ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا! آفتاب ہوکر چمکے گا۔ اور سارے ستارے اس کی روشنی میں دھندلے ہوکر نظروں سے غائب ہوجائیں گے۔

ترکوں میں رسم ہے کہ جب کوئی ایسی خوش خبری لاتا ہے تو اسے کچھ دیتے ہیں۔ ایک سفید پوش اشراف ہوگا تو اپنا چغہ ہی اُتار کر دے دے گا۔ امیر ہے تو اپنی دست گاہ کے بہ موجب خلعت اور گھوڑا نقد وجنس جو جو کچھ ہو سکے گا دے گا۔ سب کی ضیافتیں کرے گا۔ نوکروں کو انعام و اکرام سے خوش کرے گا۔ ہمایوں کے پاس جب سوار یہ خبر لایا تو اس کی حالت ایسی ہورہی تھی کہ دائیں بائیں دیکھا۔ کچھ نہ پایا۔ آخر یاد آیا کہ کمر میں ایک مشک نافہ ہے، اسے نکال کر توڑا اور ذرا ذرا سا مشک سب کو دے دیا کہ شگون خالی نہ جائے۔ اللہ اللہ تقدیر نے کہا ہوگا کہ دل میلا نہ کیجیو۔ اس بچے کی شمیم اقبال مشک کی طرح تمام عالم میں پھیلے گی۔

عبدالرحیم خان خاناں:

"964 ہجری میں بیرم خاں کا بڑھاپا اقبال کی جوانی میں لہلہا تا رہا تھا، ہیموکی مہم مار لی تھی۔ اکبر شکار کھیلتے لاہور کو چلے آتے تھے جو نغمۂ بلبل کے سُروں میں کسی نے آواز دی کہ بڑھاپے کے باغ میں رنگین پھول مبارک ہو۔ فتح کی خوشی میں یہ خوش خبری نیک شگون معلوم ہوئی۔ اس لیے بادشاہ نے جشن کیا، وزیر نے خزانے لٹائے اور اپنے بیگانوں کو انعام و اکرام سے مالا مال کردیا۔ بیرم خاں کو تو عالم جانتا ہے۔ ماں کا خاندان بھی معلوم کرلو کہ جمال خاں میواتی کی بیٹی حسن خاں میوانی کی بھتیجی تھی۔ بڑی بہن بادشاہ کے محل میں تھی، چھوٹی وزیر کے حرم سرا میں۔ خالو بادشاہ نے خود عبدالرحیم نام رکھا۔

یہ پھول قریب تین سال کے ناز و نعمت کی ہوا میں اقبال کے شبنم سے شاداب تھا۔ دفعتاً خزاں کی نحوست ایسی بگولا بن کر لپٹی کہ اس کے گلبن کو جڑ سے اُکھیڑ کر پھینک دیا، اور گھاس پھوس کی طرح مدت تک رواں دواں کرتی رہی۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ اس کا ٹھکانا بھی کہیں لگے گا یا نہیں۔ ہم کاغذوں کے دیکھنے والے ترس کھاتے ہیں۔ وائے برحال اس کے رشتہ داروں اور ہوا خواہ نمک خواروں کے، جب اس کی اور اپنی حالت یاد کرتے ہوں گے کہ کیا تھا اور کیا ہوگیا۔ مگر حق یہ ہے کہ ایسے ہی اونچے سے گرتے ہیں جب اس قدر اونچے پہنچتے ہیں کہ دیکھنے والے تعجب کرکے کہتے ہیں یہ تارا کہاں سے نکل آیا۔

خدا تر نوالہ دے خواہ سوکھا ٹکڑا۔ باپ کا ہاتھ بچوں کے رزق کا چمچہ بلکہ ان کی قسمت کا پیمانہ ہوتا ہے۔ جب بیرم خاں کے اقبال نے منہ پھیرا اور اکبر رقیبوں کی باتوں میں آکر دہلی میں آن بیٹھا۔ بیرم خاں آگرے میں رہ گئے، یہیں سے نحوست کا آغاز سمجھنا چاہیے۔ حال یہ تھا کہ رفیق ساتھ چھوڑ چھوڑ کر دہلی چلے جاتے ہیں۔ عرضیاں جاتی ہیں تو اُلٹے جواب آتے ہیں، عرض معروض کے لیے وکیل پہنچتا ہے تو قید۔ دربار کے طور بے طور۔ خبر آتی ہے تو وحشت ناک۔ بچہ معصوم ان رازوں کو نہ سمجھتا ہوگا۔ مگر اتنا ضرور دیکھتا ہوگا کہ باپ کی مجلس میں رونق نہیں۔ وہ امرا اور درباریوں کی بھیڑ بھاڑ کیا ہوگئی، باپ کس فکر میں ہے کہ میری طرف دیکھتا بھی نہیں۔

بیرم خاں بے چارہ کیا کرے۔ کبھی بنگالہ کا ارادہ کرتا ہے، کبھی گجرات کا کہ حج کو چلا جائے۔ اُدھر رستہ نہیں پاتا۔ راجپوتانہ کا رُخ کرتا ہے۔ چند روز ادھر اُدھر پھرتا ہے۔ آخر پنجاب کو آتا ہے۔ کیا ساتھ۔ اپنے حال کو سنبھالے کہ عیال و اطفال کو۔ آخر حرم سرا اور جواہر خانہ توشہ خانہ وغیرہ بہت سے لوازمات و اسباب کو بھٹنڈے میں چھوڑا۔ آپ پنجاب میں آیا۔ بھٹنڈے کا حاکم اپنا نمک پروردہ، خاک سے اٹھایا ہوا، ہاتھوں کا پالا ہوا، چھوٹے

سے بڑا کر کے حکومت تک پہنچایا ہوا۔ اس نے مال وعیال کو ضبط کر کے روانہ دربار کر دیا۔ دہلی میں آ کر سب قید۔ اسباب خزانہ میں داخل۔ وہ تین چار برس کا بچہ روز کی پریشانی اور بے سروسامانی اور گھر والوں کی سرگردانی، روز نئے شہر، نئے جنگل، دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا کہ یہ کیا عالم ہے اور ہم کہاں ہیں۔ میری ہوا خوری کی سواریوں اور سب کی دل داریوں میں کیوں فرق آ گیا۔ جو لوگ ہاتھوں کی جگہ آنکھوں پر لیتے تھے وہ کیا ہو گئے؟

اور اس کی حالت کی تصویر سے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ باپ دربار سے رخصت ہو کر حج کو چلا گیا۔ گجرات پٹن میں ڈیرے ہیں۔ ابھی سورج جھلکتا ہے۔ شام قریب ہے۔ خیال یہ کہ اب خان خاناں آتا ہے۔ خبر آئی کہ وہ تو مارا گیا۔ اس کے مرتے ہی فوج میں طلاطم مچ گیا۔ پل کے پل میں گھربار افغانوں نے لوٹ لیا۔ کوئی گٹھری لیے جاتا ہے، کوئی صندوقچہ، کسی نے مسند گھسیٹ لی، کوئی بچھونا لے چلا۔ اس بے کس مردے کے کپڑے تک اُتار لیے۔ لاش بے جان کو کفن کون دے کہ اپنی ہی جان کا ہوش نہیں۔ وہ تین برس کی جان کیا کرتا ہوگا؟ سہم کر رہ جاتا ہوگا، ماں کی گود میں دبک جاتا ہوگا، ڈرتا ہوگا، انا کے پاس چھپ جاتا ہوگا۔ افسوس وہ بے چاریاں کہاں چھپالیں کہ آپ ہی چھپنے کو جگہ نہیں۔ الٰہی تیری پناہ۔ عجب وقت ہوگا۔ شام غریباں اسی شام کو کہتے ہیں۔ رات قیامت کی رات گزری ہوگی۔ دن ہوا تو روز محشر۔ محمد امین دیوانہ اور زنبور وغیرہ لشکروں کے لڑانے والے تھے۔ اس وقت کچھ نہ بن آتی تھی۔ پھر بھی ہزار رحمت ہے کہ لٹے قافلہ کو سمیٹا ہے اور احمد آباد کو اڑے جاتے ہیں۔ موقع پاتے ہیں تو پلٹ کر ایک ہاتھ مار جاتے ہیں۔"

"شاہان گزشتہ اور امرائے سلف علوم کے ذیل میں علم اخلاق، تاریخ دانی، ہیئت، نجوم، رمل، شاعری، انشاپردازی، خوش نویس، مصوری وغیرہ وغیرہ

فنون کے اجزائے کامل سمجھ کر بڑی کوشش سے حاصل کرتے تھے۔ اور جو لوگ ان باتوں میں کمال رکھتے تھے ان کی عزت و توقیر کرتے تھے۔ خود بھی ان باتوں میں کمال یا اچھی مداخلت پیدا کرتے تھے۔ تاکہ بھلے برے کو پرکھ سکیں۔ شہ سواری، تیراندازی، نیزہ بازی، شمشیرزنی وغیرہ وغیرہ فنون سپاہ گری میں اعلیٰ درجہ کی مشق پیدا کرتے تھے۔ صیدافگنی کو ذریعۂ مشق رکھا تھا۔ مگر یہ ہنر اکبر ہی کے وقت تک کارآمد رہے۔ کیونکہ وہی تھا جو یلغار کر کے فوج لے جاتا تھا اور دفعتاً دشمن کی چھاتی پر جا کھڑا ہوتا تھا۔ میدانِ جنگ میں خود کھڑے ہو کر فوج کو لڑاتا تھا اور آپ تلوار پکڑ کر حملہ کرتا تھا۔ گھوڑا دریا میں ڈالتا تھا اور اُتر جاتا تھا۔ پھر کوئی بادشاہ اس طرح نہیں لڑا۔ آرام طلب ہو گئے۔ خوشامدی کہتے ہیں: حضور آپ کا اقبال مارے گا۔ حضور بیٹھے خوش ہو رہے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ شکار اور فنون مذکورہ جب تک اس غرض سے ہیں تب تک ہنر یا کمال جو کہو درست۔ یہ نہ ہو تو وہی عالمگیر کا قول: شکار کار بیکارانست۔"

رئیس:

"اب وہ بھی سن لو کہ بزرگانِ سلف رئیس کسے کہتے تھے، اور شاہانِ سلف رئیسوں پر کیوں جان دیتے تھے؟

(1) میرے دوستو! تمھارے بزرگ رئیس اسے کہتے تھے کہ شریف نجیب الطرفین ہو۔ یہ داغ دامن پر نہ ہو کہ ماں لونڈی تھی یا دادا نے ڈومنی گھر میں ڈالی تھی۔ یاد رکھنا ہزار دولت مند صاحب دست گاہ ہو وہیلے آدمی کا وقار لوگوں کی نظروں میں نہیں ہوتا۔ ذرا سی بات دیکھتے ہیں۔ صاف کہہ بیٹھتے ہیں۔ میاں کیا ہے؟ آخر ڈومنی بچہ ہی ہے نہ۔ ایک کہتا ہے۔ میاں نواب زادہ ہے تو کیا ہے۔ لونڈی کی بچی تو رگ ہے اثر آوے ہی آوے......

(2) رئیس کے لیے یہ بھی واجب تھا کہ وہ بھی اور اس کے بزرگ بھی صاحب

دولت ہوں۔ ان کا ہاتھ سخاوت کا پیمانہ ہو۔ اور لوگوں کا ہاتھ ان کے دست فیض کے نیچے رہا ہو۔ اگر غریب کا بیٹا تھا۔ اب صاحب دولت ہوگیا تو اسے کوئی خاطر میں نہ لائے گا۔ وہ کسی موقع پر شادی و مہمانی میں، کھلانے کھانے میں، لینے دینے میں بلکہ ایک مکان کے بنانے میں اگر مصلحتاً بھی کفایت شعاری کرے گا تو کہنے والے ضرور کہہ دیں گے: صاحب یہ کیا جانے، کبھی باپ دادا نے کیا ہوتا تو جانتا۔ کبھی کچھ دیکھا ہوتا تو جانتا۔

(3) اس کے لیے یہ بھی واجب تھا کہ نیک اطوار، خوش اعمال ہو۔ بدچلن آدمی ہزار دولت والا ہو لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہی ہوتا ہے۔ اس کی دولت آنکھوں میں نہیں جچتی...... جو شخص ان اوصاف کے ساتھ امیر ہوگا اور اس کے باپ دادا بھی امیر ہوں گے اس کے کلام اور اس کے کام کو تمام لوگوں کی نگاہوں اور دلوں میں بھی وقعت اور وقار ہوگا۔ سب اس کا لحاظ کریں گے، اور اس کے کہنے سے عدول کرنے کو ان کے دل گوارا نہ کریں گے۔ ایسے ایک شخص کو اپنا کر لینا گویا ایک انبوہ کثیر پر قبضہ کر لینا ہے۔ وہ جہاں جا کھڑا ہوگا جماعت کثیر آ کھڑی ہوگی۔ وقت پر جو کار سلطنت اس سے نکلیں گے کمینے دولت مند سے نہ نکلیں گے۔ کمینے کا ساتھ کون دیتا ہے، اور جب یہ بات نہیں تو بادشاہ اسے لے کر کیا کرے۔

(4) اس کے لیے یہ بھی واجب تھا کہ آپ سخی ہو۔ کھانے کھلانے والا ہو۔ فیض رساں اور لوگوں سے نیکی کرنے والا ہو۔ اگر بخیل ہے اور باوجود اختیار کے لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تو اسے بھی کوئی خاطر میں نہ لائے گا۔ صاف کہہ دیں گے: بے فیض اگر حاتم ثانی ہے تو کیا ہے؟ دولت ہے تو اپنے گھر لیے بیٹھا رہے۔ ہمیں کیا: میراب نہ ہو جس سے کوئی تشنۂ مقصود۔ اے ذوق جو وہ آب بقا بھی ہے تو کیا ہے

(5) اس کے لیے یہ بھی واجب تھا کہ فضیلت علمی کے لحاظ سے عالم فاضل نہ

ہو مگر ملک کی زبان ہائے علمی سے واقف ہو۔ اگر ایشیائی ملکوں میں ہے تو زبان عربی و فارسی کی معمولی کتابیں پڑھا ہو۔ علوم وفنون مشہورہ کی ہر شاخ سے باخبر ہو۔ خود کمالات کا شائق ہو اور ان کے ذکر و اذکار سے لطف اٹھاتا ہو۔ کیونکہ بےعلم اور بےلطف آدمی جس کا دل و دماغ اس نور سے روشن نہ ہوگا وہ شاگرد کے دماغ کو کیا روشن کرے گا۔ جس کو ملک کا بادشاہ ہونا ہے اور کشور اور اہلِ کشور کے دماغوں کو اس سے روشن کرنا ہے۔ اگر اتالیق کا دل علوم کے تذکروں سے لطف اٹھاتا ہوگا اور علم کی بات سن کر دل چٹکارہ بھرتا ہوگا تو شاگرد کے دل میں بھی اس کی تاثیر دوڑا سکے گا۔ اور ہمیشہ اس کے دلچسپ چرچے رکھے گا۔ خود مزا نہ ہوگا تو روکھی سوکھی خالی عبارتوں کی بک بک سے شاگرد کے دل کو کیا مائل کرے گا۔ اور وہ مائل ہی کب ہوگا۔ علمی مطالب اس کے سامنے ایسے ڈھب سے پیش کرے کہ جس طرح مزے کی چیز کھا کر یا خوشبو سونگھ کر یا خوش رنگ پھول دیکھ کر مزا آتا ہے، اسی طرح علمی مسائل سن کر مزا آئے۔ اور تم خوب سمجھ لو۔ جب تک علم کا مزا نہیں تب تک کچھ آنا ممکن ہی نہیں۔ جسے یہ نہیں اسے علم کی قدر کیا ہوگی۔ اور اہلِ علم کی قدر کیا ہوگی۔ اور وہ اپنے ملک میں علم و کمال کب پھیلا سکے گا۔ اہلِ کمال اس کے دربار میں کیا جمع ہو سکیں گے۔ اور یہ نہیں تو سلطنت نہیں۔

علم مجلس:

''علم مجلس کہ جزئیات مذکورہ کی معلومات کے بعد حاصل ہوتا ہے اس کا جزو اعظم فصاحت کلام اور حسن تدبیر ہے۔ اور وہ ایک خداداد امر ہے۔ جسے خدا دے۔ ایک عالم فاضل آدمی ایک مطلب کو بیان کرتا ہے کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ کیا کہا۔ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی کیسی دربار یا جلسہ میں اس طرح بات کہتا ہے کہ بےعلم نوکروں تک کے کان بھی اُدھر ہی لگ جاتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ وقت اور موقع کلام کو پہچانے۔ آنکھوں کے رستے دل میں اُتر جائے۔ ہر ایک کی طبیعت کا انداز پائے۔ اس کے بموجب اپنے مطالب کو لباس تقریر پہنائے اور رنگ بیان چڑھائے۔ غلام ہوں ان صاحب کمال سحر بیانیوں کا کہ ایک بھرے جلسہ میں تقریر کررہے ہیں، مختلف الرائے، مختلف خیال، مختلف مذہب کے لوگ بیٹھے ہیں مگر ان کی تقریر کا ایک نقطہ بھی کسی دل پر ناگوار ہوکر نہیں کھٹکتا۔ ایک خوانچہ والے کا لڑکا یا ایک جلاہے کا بیٹا مسجد میں رہ کر عالم فاضل ہوگیا۔ یا کالج میں پڑھ کر بی اے، ایم اے ہوگیا تو ہوا کرے۔ مقاصد مذکورہ بالا اور علم مجلس اور آداب محفل کی اس غریب کو کیا خبر۔ وہ آپ ہی نہیں جانتا۔ شاگرد کو کیا سکھائے۔ درباروں، سرکاروں کی ڈیوڑھی تک اس کے باپ دادا کو جانا نصیب نہیں ہوا۔ وہ بے چارہ وہاں کی باتیں کیا جانے۔ اور کہیں لکھا دیکھ کر یا سن سنا کر معلوم بھی کرلیا تو کیا ہوتا ہے۔ یہ کہاں اور وہ لوگ کہاں! جو اسی دریا کی مچھلی تھے۔ بزرگوں کے ساتھ تیر کر بڑے ہوئے تھے۔ ان کا دل کھلا ہوا تھا۔ ان کو وقت پر قواعد و آداب کی سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔ اپنے موقع پر خود بخود اعضا میں وہی حرکت پیدا ہوجاتی تھی۔ اب بھی نئے روشن ضمیر، نوتعلیم یافتہ کہیں جا پہنچتے ہیں تو سلام کرنا بھی نہیں آتا۔ میرے دوستو! ان کے ہوش بجا نہیں رہتے۔ چلتے ہیں، قدم ٹھکانے نہیں پڑتا اور نظر باز بھی وہیں کنارے کھڑے ہیں۔ بات بات کو پرکھ رہے ہیں کہ یہاں چوکا وہاں بھولا۔ یہ ٹھوکر کھائی۔ وہ گر پڑا۔ پھر صاف کہہ دیتے ہیں کہ مولوی صاحب خواہ بابو صاحب ٹکسال باہر ہیں۔ خیر! اب نہ وہی دربار، نہ وہ سرکار۔ جہاں ٹوٹا پھوٹا کارخانہ ہے اس کا رنگ بدلتا جاتا ہے۔ خوب ہوا۔ خدا نے سب کا پردہ رکھ لیا۔"

شیخ مبارک:

"شیخ مبارک نے پھر گوشۂ عزلت سنبھالا۔ بڑا شغل کوشش کا یہی تھا کہ باطن

کو دھوتے رہتے تھے۔ اور ظاہر کو پاک رکھتے تھے۔ روئے نیاز کارسازِ حقیقی کی طرف کیا۔ اور علوم و فنون کے درس سے دل بہلانے لگے۔ اوروں کی گفتگوؤں کو اپنے حال کا پردہ کرلیا۔ خواہش کی زبان کاٹ ڈالی۔ معتقدوں میں سے کوئی بااحتیاط آدمی اخلاص سے نذر لاتا تو ضرورت کے قابل لے لیتے۔ باقی لوگوں سے معذرت کر کے پھیر دیتے۔ اور ہمت کے ہاتھ اس سے آلودہ نہ کرتے......

چند روز میں چھوٹے سے لے کر بڑے تک اسی چشمے پر آنے لگے۔ اور داناؤں اور دانشوروں کا گھاٹ ہوگیا۔ بعضے حسد کے مارے سازشیں کرنے لگے، بعضے محبت سے ملے اور رفیقِ خلوت ہوگئے۔ شیخ مبارک کو نہ اس کا رنج تھا نہ اس کی خوشی تھی۔ شیر شاہ اور سلیم شاہ نے اور بعضی اور لوگوں نے چاہا کہ یہ خزانۂ شاہی سے کچھ لیں اور جاگیر مقرر ہوجائے۔ ہمت بلند تھی، نظر نہ جھکی۔ اس سے ترقی کا رتبہ اور بڑھا۔ پرہیزگاری اور احتیاط کا یہ عالم کہ بازار میں کہیں گانا ہوتا تو قدم اٹھا کر جلد نکل جاتے۔ چلتے تو دامن اور پائجامہ اونچا کر کے چلتے تھے کہ نجس نہ ہوجائے۔ کوئی محفل میں نیچا پاجامہ پہن کر آتا تو جتنا زیادہ ہوتا پھڑوا ڈالتے۔ لال کپڑا پہنے دیکھتے تو اُتروا ڈالتے۔ ظاہر پرست اور بوالہوس جلتے اور گھبراتے۔ انھیں مباحثوں کے جھگڑے اور دکان داری کی بھیڑ بھاڑ بڑھانی منظور نہ تھی۔ ہاں! حق کے اظہار اور بدکاروں کی ملامت میں ذرا تخفیف نہ کرتے تھے۔ جو بدکتے انھیں پر چاتے نہ تھے۔"

"افسوس وہ خانِ زماں جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے فوجوں کے دھوئیں اڑتے تھے اسے ہاتھی روندکر ہوا کی طرح اور طرف نکل گیا اور وہ خاک پر سسکتا رہ گیا۔ اللہ اللہ جس بہادر کو فتح و اقبال ہوا کے گھوڑے پر چڑھاتے تھے، جس عیش کے بندے کو ناز و نعمت مخملوں کے فرش پر لٹاتے تھے وہ خاک

پر پڑا دم توڑتا تھا۔ جوانی سرہانے کھڑی سر پیٹتی تھی اور دلاوری زار زار روتی تھی۔ سارے ارادے اور حوصلے خواب و خیال ہو گئے تھے۔ ہاں خانِ زماں یہ یہاں کا معمولی قانون ہے۔ تم نے ہزاروں کو خاک و خون میں لٹایا۔ آؤ بھائی اب تمھاری باری ہے۔ اسی خاک پر تمھیں سونا ہوگا۔"

OOO

محمد حسین آزاد دہلی کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ وہ ذوق دہلوی کے شاگرد تھے اور مولوی محمد باقر کے فرزند۔ مولوی محمد باقر ایک بااصول صحافی اور روشن خیال دانشور کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ محمد حسین آزاد ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد دہلی کالج میں داخل ہوگئے۔ وہ زمانۂ طالب علمی سے ہی اپنے والد کے اخبار 'دہلی اردو اخبار' میں دلچسپی لینے لگے تھے مگر 30 اکتوبر 1853 کے شمارے سے باقاعدہ ان کا نام پرنٹر پبلشر کی حیثیت سے اخبار میں چھپنے لگا۔ آزاد نے زندگی کو ہر رنگ میں دیکھا اور زندگی نے بھی آزاد کو بہت آزمایا۔ اردو کی ادبی تاریخ میں انھیں ایک منفرد نثر نگار کی حیثیت حاصل ہے۔ مہدی افادی نے انھیں اردو نثر کے عناصر خمسہ میں سے ایک بتایا ہے۔ 'آب حیات' اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اردو کی پہلی ادبی تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی نثر کا جادو تو اب بھی سر چڑھ کے بولتا ہے۔ محمد حسین آزاد نظم جدید کے بنیاد گزاروں میں تھے۔ آزاد کی تحریک پر ہی انجمن پنجاب نے روایتی مشاعروں کے برخلاف ایسے مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا جن میں مخصوص موضوعات پر نظمیں پیش کی جاتیں۔ اس سلسلے میں آزاد کے معرکہ آرا لکچر "نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات" کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

محمد حسین آزاد پر یہ مونوگراف پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے تحریر کیا ہے۔ جن کا شمار اردو کے اہم ناقدین میں ہوتا ہے۔ وہ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ اس شعبے کے صدر اور فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین بھی رہ چکے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں مشرقی شعریات اور اردو تنقید، تخلیقی تجربہ اور شاعری کی تنقید وغیرہ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ انھیں ساہتیہ اکادمی انعام مل چکا ہے اور کئی صوبوں کی اردو اکادمیوں نے بھی انھیں انعامات سے نوازا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

ISBN 978-93-5160-110-4
9 789351 601104
NCPUL
New Delhi
₹ 85.00